ماہنامہ قندیل ادب انٹرنیشنل لندن

شمارہ:69 ماہ ستمبر 2018

QINDEEL-E-ADUB INTERNATIONAL
80 STRATHDONE DRIVE SW170PW LONDON
(M) 0044-7886-304637, 02089449385
www.qindeel-e-adub.com, ranarazzaq52@gmail.com

اُردو ادب کا بین الاقوامی میگزین جو لندن سے شائع ہوتا ہے۔

ऊर्दू अदब का अंतरराष्ट्रीय मैगज़ीन जो लंदन से प्रकाशित होता है

A Magazine of Urdu Literature and Poetry from London

نیا پاکستان नया पाकिस्तान NEW PAKISTAN

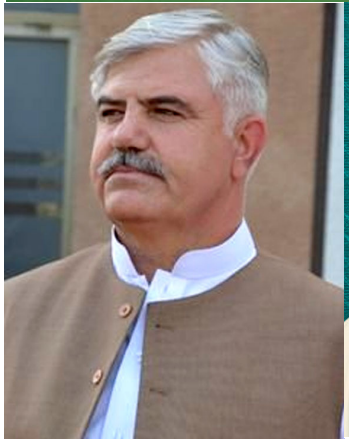

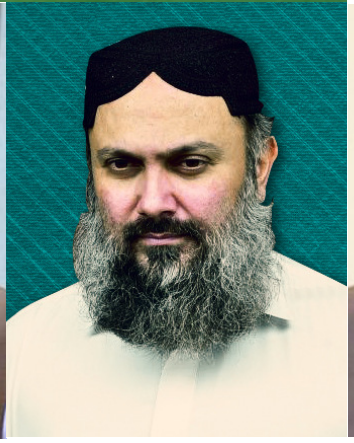

24 YEAR EXPERIENCE FAST TRACK UMRA VISA SERVICE

Special Flight

But Choice For Worldwide Flights

عمرہ اور ویزہ کے جلد حصول اور مناسب قیمتوں پر ٹکٹ اور ویزہ کیلئے ہم سے رابطہ کریں۔ ہمیں پچھلے 24 سالوں سے عوام کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔ دُنیا بھر کے ممالک کیلئے کسی بھی وقت اور کسی بھی ایئر لائن کی ٹکٹ کے حصول کیلئے ہم سے رابطہ کریں۔ ہم آپ کو انشاء اللہ تعالیٰ فوری اور مناسب داموں پر ٹکٹ مہیا کر کے دیں گے۔

we are working under
IATA and ATOL bonded agent

Unit 47, Broadway Market, London SW170RJ

Tel: 020 8672 2693

Email: Specialflights@btinternet.com

Wimbledon Solicitors

AKEEL MIYAN IMMIGRATION CONSULTANT

T: 020 8543 3302 F: 020 8543 3303

E: akeel@wimbledonsolicitors.net

w: www.wimbledonsolicitors.net

191 Merton Road, South Wimbledon, London, SW19 1EE

271 Balham High Road, Tooting Bec, London SW17 7BD

24 HOUR HELPLINE: 0788 303 1585 / 079 5844 0790

We specialist in immigration, Family Law and Child Care matters and public funded service (Legal Aid). We have qualify staff who are able to converse in Hindi, Urdu, Pashto, Gujarati, Telugu, and Tamil. Injured in an Accident and not your fault? Contact our specialist Personal Injury Department. We deal with RTA, MIB and CICA claims.

*** No-WIN-No FEE * 100% Compensation** (no deductions)

*** Quick settlement * Home Visits.**

Call us on **020 8767 0800**

MORDEN SOLICITORS

Building Your Future Together

We deal in:-

- Property Matters, Residential & Commercial, Conveyancing, Wills and Probate, etc
- Unfair dismissal, Discrimination at work, etc
- Unfair dismissal, Discrimination at work, etc
- Appeals, Asylum, Removals, Judicial reviews, immigration, work permit, HSMP, etc
- Injury at work or had an accident
- Matrimonial, Adoption, Divorce, etc.

We offer Quality Assistance and services to you for making a difference to .

Family Matters | Employment | Immigration | Personal Injury | Conveyancing

If you have any of the above problems

Call us *WHY WAIT*

just give us a **CALL NOW** and book your

FREE appointment at **020 8646 9691**

Our highly skilled and qualified ADVOCATES/ SOLICITORS & accredited staf will provide you with quality service

All calls are dealt with **Strict Confidentiality**

You can email us at: mail@mordensolicitors.co.uk

Address: 7-7A London Road, Morden, Surrey SM4 5HT

Dr. Hamidullah Khan

M.B.B.S M.F. Hom. LIC Acup

Homoeopathic &

Acupuncture Physician

11 Beverley Close, East Ewell

Epsom, Surrey, KT17 3HB

Tel: 0208393204

Mob . 07929004186

Email: hamidullah.khan@gmail.com

BSC ELECTRICAL ENGINEERS

Part P Approved Contractor

Certification

Rewire PAT Testing

Replacement Fuse Board

Fault Detection

Contact:

SAMIULLAH

07432715797

E-mail:

ssami19693@hotmail.com

Web: bscelectricalengineers.co.uk

HEATING LTD.

Domestic & Commercial

Contact: 07722 222 965

www.247breakdownsolution.co.uk

مجلس ادارت

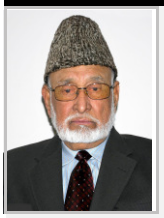

بانی رُکن

خان بشیر احمد رفیق مرحوم

مدیر

رانا عبدالرزاق خان

اراکین ادارتی بورڈ

آدم چغتائی، ڈاکٹر منور احمد کنڈے، رضیہ اسمٰعیل برمنگھم، رند ملک کنیڈا، اسلم ناصر آسٹریلیا، اے حق یو کے ٹائمز، ثقلین مبارک آسٹریلیا، رانا مبارک احمد بحرین، بشیر احمد خان سویڈن، راجہ منیر احمد، ڈاکٹر منصور خوشتر بھارت، منور احمد خورشید۔ امجد مرزا امجد، طارق مرزا آسٹریلیا، عبد القدیر کوکب، بشارت احمد چیمہ۔

التماس

ہم سب دوستوں سے التماس کرتے ہیں کہ اپنے ادبی فن پارے، غزل، نظم، افسانہ، مشاعرے کی روئیداد وغیرہ جو بھی اِن پیج میں ارسال کیا جائے گا۔ بلا تفریق اسے معیار کے مطابق شائع کر دیا جائے گا۔ مراسلہ نگاروں کی قدر کی جاتی ہے۔ قندیل ادب اکثر ممالک میں لاکھوں قارئین تک جاتا ہے۔ اور ویب سائٹ سے بھی پڑھا جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس ادبی فن پارے کوئی نہیں تو اپنے ریمارکس ہی ارسال کر دیا کریں تا کہ ہم اپنا محاسبہ کرتے رہا کریں۔ شکریہ

رانا عبد الرزاق خاں

فہرست مضامین

آپ کے خطوط		4
بدخواہوں سے نجات (اداریہ)	رانا عبدالرزاق خان	5
مشاعرہ قندیل شعروسخن لندن	رپورٹ: اے آر خان	6
غزلیات: عبدالسلام اسلام، آدم چغتائی، عاصی صحرائی، ہدایت اللہ شاہ جرمنی، سہیل لون، شائق نصیر آبادی، ایک پرانی غزل دیا جیم، ناصرہ زبیری، عبدالحمید حمیدی کنیڈا، اطہر حفیظ لون، امجد مرزا امجد، حسن عباسی، انشاء جی، مبارک صدیقی، آفتاب اختر، مسعود چودھری جرمنی،		7 سے 11
لیگی حکومت جاتے جاتے کشمیر کے عبوری آئین میں..	ابن لطیف	12
مشتاق احمد یوسفی	ادارہ	13
پکی قبر	مبشرہ ناز	14
پھیکا	بشریٰ ناز	15
میں نے گورکن بابا سے پوچھا	ادارہ	16
رکشے والا ایک سچی کہانی	عارف نقوی برلن	17
ملاں کی داڑھی میں تنکا	منطق الطیر	19
نواب سر صادق محمد خان عباسی	ادارہ	21
ایک دلچسپ اور نکتہ خیز تحریر	ادارہ	22
پاک فوج کا ماٹو اور سراج الحق صاحب کی منطق	طارق احمد مرزا	24
مسجد کا مولوی	سید وجاہت علی	26
امجد مرزا امجد کے ساتھ چند قہقہے	امجد مرزا امجد	27
بہادر شاہ ظفر	عاصی صحرائی	28
شائق نصیر پوری کا اندازِ سخن	امجد مرزا امجد	30
نواں ماڈل	امجد مرزا امجد	31
تیسری شادی	معصوم خاوند	32
اپنی خوراک بدلیں	وسعت اللہ خان	32
جن کا بھٹو ابھی تک زندہ ہے ان کی بھی سن لیجئے	ادارہ	33
کراچی اور کراچی والے	الطاف شکور	34
جبران ناصر	فرنود عالم	35
خوبصورت پڑوسن اور نیلا دوپٹہ	ادارہ	37
فرانسس برنیئر پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا	ادارہ	39

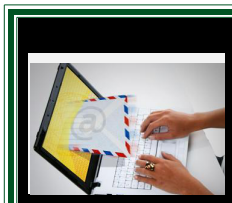

آپ کے خطوط

نامے جو مرے نام آتے ہیں

جناب محترم ایڈیٹر قندیل ادب انٹرنیشنل، آداب

میں معذرت خواہ ہوں کہ بے حد مصروفیات کی وجہ سے آپ کو کوئی اپنی تخلیق ارسال نہ کر سکی۔ مگر پھر بھی گاہے گاہے میرے حوالے سے کوئی نہ کوئی تحریر میگزین میں دیکھنے کو ملتی رہتی ہے۔ جس کے لئے میں دلی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ''قندیلِ ادب انٹرنیشنل لندن'' کی کامیابی پر تمام ادارتی اراکین کو دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں کہ اس رسالہ کا ادبی وقار اور معیار یوں ہی پروان چڑھتا رہے۔ آمین۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

چند غزلیں بھیج رہی ہوں شائع کرنے کے لئے نوازش۔

(شمع چوہدری ساؤتھ ویلز یو کے)

اداریہ

رانا عبدالرزاق خان

بدخواہوں سے نجات

جوں ہی پاکستان وجود میں آیا اُس کے سب بدخواہ فوراً! پاکستان میں آدھمکے۔تاریخ کو پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ قیام پاکستان کے وقت سب مذہبی لیڈرز کانگرس کے ساتھ تھے اور مخالف قیام پاکستان دشمن تھے۔جو قائداعظم کو دشمن اور کافر کہتے رہے۔کانگرس کی کفش برداری میں شب و روز مصروف رہے۔۱۹۴۵ کے الیکشن میں ان مسلم جماعتوں نے قیام پاکستان کی بھرپور مخالفت کی اور جوں ہی پاکستان بنا یہ علمائے سُو فوراً اسی پلیدستان (بقول احرار) میں آدبکے۔علمائے دیوبند، جماعت اسلامی، باچا خان، جمیعت احرار، خاکسار، بریلوی، بٹالوی، مدنی، مودودی، بخاری، سب الاٹمنٹ کے چکر میں پاکستان آگئے۔ پہلے تو ۶ سال تک گدھ کی طرح دور دور رہے مگر پھر ۱۹۵۳ میں اپنا وجود تسلیم کروانے کے لئے دولتانہ کے کندھوں پر بیٹھ کر ختم نبوت کے نام پر ہنگامہ کیا اور عدلیہ کی طرف سے منہ کی کھائی۔مودودی اور نیازی کو پھانسی کی سزا ہوئی۔پھر معافی دلائی گئی۔انہی قوتوں نے بنگلہ دیش کی راہ ہموار کی۔مگر ۱۹۷۰ کے الیکشن میں پھر زیرو ہو گئے۔ کیونکہ عوام ان کو خوب پہچانتے تھے۔پھر یہی نام نہاد اسلامی قوتیں شاہ فیصل اور بھٹو کے کندھے پر بیٹھ کر سیاست میں آئیں۔ضیاع الحق سے مل کر سعودی ریال اور امریکی ڈالر کے سہارے جہاد افغانستان کی آڑ میں اپنا سکہ جمایا۔ضیاء الحق نے نواز شریف کو اپنا بیٹا بنایا اور اسلامی قوتوں کو آئی جے آئی کی صورت میں نواز شریف کا سہارا بنا کر خود واصل جہنم ٹھہرا۔

نواز شریف نے خوب اسلام کا نام استعمال کیا بلکہ اب تو امیر المومنین بننے کو تھا کہ اس کی کرتوتوں سے خدا ناراض ہو گیا۔نام نہاد مذہبی تنظیموں نے خوب اپنے پاؤں جمائے۔انسانی اور اخلاقی، مذہبی، قوانین کی پامالی کے بعد اقلیتوں پر ظلم شروع کر دیا، ملکی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر بیرون ممالک منتقل کر دیا۔قتل و غارت بذریعہ مذہبی علماء کرایا گیا۔خون کی ندیاں بہائی گئیں کشمیر کو پسِ پشت ڈالا گیا۔لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔علمائے سُو کو بھونکنے کے لئے آزادی دے دی گئی۔ادارے تباہ کئے گئے۔وَن مین شو شروع کر دیا گیا۔عوام کو بھی نظر انداز کیا گیا۔بے شمار قرضے لئے گئے۔کمیشن خوب کمایا گیا۔عوام پر مہنگائی اور ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔لوکل کونسلز کے انتخابات اور اختیارات کو نظر انداز کیا گیا۔پٹواری کے ذریعہ مالی نظام کو اپنی مٹھی میں لیا گیا۔پولیس کو اپنے گھر کی لونڈی بنا لیا گیا۔پنجاب کا سارا بجٹ لاہور پر لگانے کی کوشش کی گئی۔میرٹ کو روندا گیا۔ہر جعلی چیز کو پرموٹ کیا گیا۔جعلی ڈگری کی حوصلہ افزائی کی گئی۔اقرباء پروری عام کی گئی۔عوام کے ٹیکس کا روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔جعلی پولیس مقابلوں میں ماؤں کے لال بے گناہ قتل کروائے گئے۔ماڈل ٹاؤن کے ۱۴ قتل دن دیہاڑے کئے گئے۔ججوں کے ذریعہ من مرضی کے فیصلے کروائے گئے۔ہر ادارے میں حکومتی کارندوں کی مداخلت کو عام کیا گیا۔نظام بچہ سکہ کی یاد تازہ کر دی گئی۔اور ملک کی بربادی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔علمائے سُو کا منہ بند کر کے اپنے ساتھ ملایا گیا۔وزارتِ خارجہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر انڈیا کو دریاؤں پر بند بنانے کی کھلی چھٹی دی گئی۔نندی پور پراجیکٹ میں ہزاروں ارب ڈالرز کرپشن کی نذر کر دیئے گئے۔لاہور میں آشیانہ سکیم اور دیگر اسکیموں کے ذریعہ خوب روپیہ کمایا گیا۔اقلیتوں کے ساتھ بدترین سلوک کیا گیا، ہزاروں ہندو انڈیا بھاگ گئے۔لاکھوں احمدی بیرون ممالک چلے گئے۔ملک کی ساری دنیا میں بدنامی ہوئی۔اور اسلام کی جگ ہنسائی ہوئی۔مگر ان بے شرموں اور بے غیرتوں کو کیا۔آخر اللہ کریم غیور و قہار کو غصہ آیا تو ایک پل میں اس پلید اور ناکام حکومت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔علمائے سُو کے منہ میں بھی شکست کی خاک پڑ گئی اور اس تیس سالہ اقتدار کے جن کو بھی ان کے دماغ سے نکالا گیا۔عوام نے مذہبی علماء کی بجائے امین اور صادق لوگوں کو ووٹ دیا۔اور وہ شخص جس کو یہ یہودی اور نہ جانے کیا کچھ کہتے تھے، ملک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔یہ لوگ آدھے جیل میں ہیں اور آدھے کھیل میں۔سعد رفیق ریل میں۔خدا تعالیٰ بڑی طاقت ہے۔وہی اصل مقتدر ہے۔وہی حاکم ہے۔اب دعا ہے کہ یہ پی ٹی آئی بھی اپنی اوقات میں رہے ورنہ ہمارا خدا سب دیکھ رہا ہے۔اے اللہ تو اس ملک کو ترقی دے۔

اے اللہ میری قوم کو اس ذلت سے نکال ہاتھ پھیلائے مسلمان برا لگتا ہے

9/اگست 2018ء

مشاعرہ قندیل شعروسخن لندن

رپورٹ
اے آر خان

مورخہ ۹ اگست ۲۰۱۸ء کی شام پانچ بجے اکرائیڈن ہال سکینہ ہل میں منعقد ہوا۔جس کی صدارت جناب محترم ضیاء اللہ مبشر صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض رانا عبدالرزاق خان نے ادا کئے۔ پاکستان سے تشریف

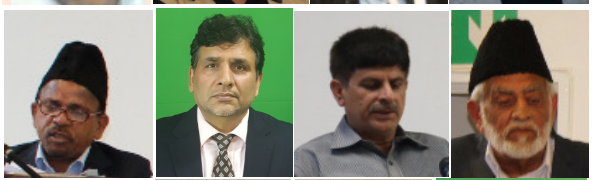

لائے ہوئے مہمان شعراء میں ضیاء اللہ مبشر صاحب،عبدالصمد قریشی،جرمنی سے اسحاق اطہر،کنیڈا سے تشریف لائے ہوئے عبدالحمید حمیدی،لندن سے عبدالقدیر کوکب،شائق نصیر پوری،ڈاکٹر صوفیہ سطوت،ہدایت اللہ شاد،اسحق عاجز، واحداللہ جاوید،محمود علی محمود،منظور ریحان،رفیق احمد

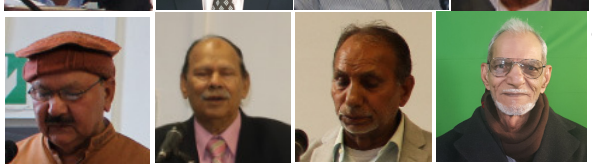

شاکر،یعقوب بابا کنیڈا، نے شرکت کی۔ پہلے دور میں شائق نصیر پوری کی کتاب ''شب تاب سخن'' کی تقریب رسم رُونمائی تھی۔جس میں نذیر فتح پوری انڈیا،امجد مرزا امجد،ڈاکٹر منور احمد کنڈے کے

مقالہ جات مرزا محمد انور،بشارت نعیم،نے پڑھ کر سنائے۔جن میں سب ادباء شعراء نے اس کتاب کی اہمیت پر تبصرہ فرمایا تھا۔آخر میں شائق نصیر پوری نے اس کتاب کے بعض مراحل کا بھی تذکرہ کیا اور کچھ اپنی شاعری بھی سنائی۔رانا عبدالرزاق خان نے اس کتاب پر بہت ہی خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا۔اُس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا۔ تلاوت جناب عبدالقدیر کوکب نے کی جبکہ نعت اسحاق عاجز نے سنائی۔جن کے ترنم سے اک سماں بندھ کیا اور واہ واہ کی آوازوں نے محفل کو گرما دیا۔عبدالحمید حمیدی نے اپنی شاعری ترنم سے اس خوبی سے سنائی کہ انہوں نے مشاعرہ ہی لوٹ لیا۔پھر اسحق عاجز نے تو اپنے سُر کے خوب جادو جگائے۔آخر پر پروفیسر عبدالصمد قریشی،اور ضیاء اللہ مبشر جو کہ دونوں ہی کہنہ مشق شاعر ہیں نے سامعین کو خوب خوش کیا۔ہر طرف سے مکرّر مکرّر کی آوازیں آرہی تھیں۔سامعین جو کہ بار بار سننے کے لئے بے تاب تھے،حال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔آخر ساڑھے آٹھ بجے مشاعرہ کا اختتام ہوا آخر میں سب حاضرین کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔اور مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔سب احباب بہت خوش تھے۔اور سب نے تعاون بھی کیا۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے مشاعرے کرنے کی ہمیشہ توفیق دیتا رہے۔آمین۔

غزلیات

عبدالسلام اسلام

نعت

کارگاہِ ''کُن فکاں'' کا راز میرا مصطفیٰ
دونوں عالم کا ہے گویا ناز میرا مصطفیٰ

ابتدائے حسن بھی، انتہائے حُسن بھی
عشق کا انجام اورآغاز میرا مصطفیٰ

کس کے رُخ پر ہیں تصدق لالہ وگل، یاسمیں
ناز پھولوں پر مجھے گلناز میرا مصطفیٰ

رشک سے تکتے ہیں وہ ستارے چرخ کے؟
چودھویں کا چاند کیا مہناز میرا مصطفیٰ

ہاں زمانے بھر کے سرداروں کا ہے سردار وہ
ہر کسی ممتاز سے ممتاز میرا مصطفیٰ

رہ گئے حیراں فرشتے کس کا جلوہ دیکھ کر؟
نوریوں کوصورتِ اعجاز میرا مصطفیٰ

فخرِ انسانی اگر تو رشک جبرائیل بھی
پاگیا کس قدر اعزاز میرا مصطفیٰ

جگمگاتا ہی رہے گا اُس کا ہر نقشِ قدم
تا ابد ہے مہرو ماہ کا ناز میرا مصطفیٰ

سجدہ ریزی سے گیا سدرہ سے بھی آگے نکل
جانتا تھا عشق کی پرواز میرا مصطفیٰ

منورؔ احمد کنڈے

سجدے کرے نہ دل تو اطاعت ہے رائیگاں
ایمان کے بغیر عبادت ہے رائیگاں

دل میں اندھیری رات کو بازار بند ہے
خوابوں کو بیچنے کی تجارت ہے رائیگاں

جس آئینے کی تجھ پہ حقیقت عیاں نہ ہو
اُس آئینے سے فعلِ محبت ہے رائیگاں

رشوت کی خو ہے قصر میں شاہوں کا مشغلہ
نادان افسروں کی شکایت ہے رائیگاں

در ہی نواح میں ہے نہ دیوار ہے کوئی
گویا مکانِ دل کی حفاظت ہے رائیگاں

کہتی ہے ذاتِ خار سے اُفتاد رات دن
بگڑے ہوؤں کو درسِ نصیحت ہے رائیگاں

ملتا نہیں ہے کچھ بھی منورؔ حیات سے
سانسوں کا بوجھ ڈھونے کی محنت ہے رائیگاں

عبدالسلام اسلام

اُلفت کا جال جب وہ بچھاتا چلا گیا
میں خود بخود اُس دام میں آتا چلا گیا

گرچہ وہ میرے زخم پر چھڑکا کئے نمک
میں پھر بھی اُس کا غم بٹاتا چلا گیا

آنسو مرے کو قوتِ گویائی مل گئی
یوں حالِ دل کسی کو سناتا چلا گیا

مجھ کو درِ محبوب سے دھکے دیئے گئے
لیکن میں اُس کے قُرب میں آتا چلا گیا

اپنے حقوق مانگے تو کچھ نہ ملا جواب
آنکھیں بدل کے آنکھیں دکھاتا چلا گیا

واعظ ہو چپ کسی طرح سو سو کئے جتن
پر ہر گھڑی وہ سر مرا کھاتا چلا گیا

بزمِ وطن میں جسکی رہی بات اَن سُنی
دنیا کی انجمن پہ وہ چھاتا چلا گیا

تصویر مری اور اُبھرتی چلی گئی
جتنا کہ نقش اپنا مٹاتا چلا گیا

آزادیِ ضمیر کی میں نے جو بات کی
سُنتے ہی بات، باتیں بناتا چلا گیا

اسلامؔ کا گلا وہ دباتے رہے مگر
اُونچے سُروں میں پھر بھی یہ گاتا چلا گیا

آدم چغتائی

اشتیاقِ جاں نثاری، بر ادائے مہرؐ دیں
عشق میں مشہور ہیں مسرورؓ بھی صد آفریں

آفتابِ حق سے ویرانے بھی اب روشن ہوئے
ظلمتوں کے شہر میں جب آ گیا نورِ مبیں

امن کا پرچم محبت سے ہوا ہے سر بلند
سارے ادیاں کو کیا ہم نے محمدؐ کے قریں

ہر طریق فکر کو اپنا بنا کے ہمرکاب
احمدیت کو کیا کچھ اس طرح سے جاں گزیں

جز تیرے محبوب کے کوئی یہاں خوباں نہیں
کہہ گئے مہدیؑ برحق بات یہ کتنی حسیں

زندگی میں پیچ و خم دیکھے بہت آدمؔ مگر
کام اپنے آ گئے ہیں صادقِ وعدِ امیں

سوہن راہیؔ

تنہائیوں میں زخمِ وفا بولتا رہا
سچائیوں کا زہر مجھے سوچتا رہا

میں نے مٹا دیا تھا ہر اک نقش خاک سے

لیکن یہ وقت بھید میرے کھولتا رہا
پلکوں پہ جگنوؤں کی قطاریں سجی رہیں
شب بھر اندھیرا موتی مرے رولتا رہا
وہ کون سی وفا تھی جو میری سزا بنی
وہ کن ترازوؤں میں مجھے تولتا رہا
شبنم کے ہار بن چکا جب پات پات پر
وہ ڈال ڈال میرا پتہ پوچھتا رہا
دشتِ نگاہ میں سرمئی آنچل نچوڑ کر
وہ رنگ رنگ میں مجھے ہی کھوجتا رہا
منصور بھی کمال کا تھا، راہِ عشق میں
ہر اِک قدم پہ سچ کی زباں بولتا رہا

عاصی صحرائی

ہے قیامت کا اندھیرا اور محشر تیرگی
جل گیا سارا جہاں پہنچی ہے گھر گھر تیرگی
چار سُو ہے کُفر کی تیرگی آتی نظر
شرک ہے، الحاد ہے، اور ہے یہی شر تیرگی
ہے پرستش مادیّت کی، چار جانب ہے یہی
روشنی دیکھی جہاں اب اُس ہی در پر تیرگی
ناخدا سب معبدوں کے ہر جگہ مدہوش ہیں
اُن کے جذبوں میں اُتر آئی سراسر تیرگی
ہے عجم بھی اور عرب بھی نور کو ترسے ہوئے
نور آتا ہے تو کہتے ہیں کہ بہتر تیرگی
رات بھر طیور تلاشِ روشنی کرتے رہے
ہو گئی سورج کے آنے سے منور تیرگی
ہے زمین و آسماں میں نور سب اللہ کا
اس سے مٹتی ہے زمانے میں برابر تیرگی
نور کی قندیل لے کر پیر عاصیؔ آ گئے
اب تو بھاگی جا رہی ہے جو تھی اندر تیرگی

ہدایت اللہ شاد جرمنی

ہر ہر دیار محفلِ جاناں سجائیں گے
اور صبح و شام جشنِ بہاراں سجائیں گے
بکھرے ہوئے اُداس ہیں جو دہر میں ہنوز
چُن چُن کے پھول زینتِ گلشن بنائیں گے
خواہ ہو کسی کے سر بھی ہو ویرانیوں کا دوش
نوحہ کناں کو جانفزا مژدہ سنائیں گے
وہ دن گئے کہ نالہ بُلبُل تھا بے اثر
صیاد کو بھی نغمہ بُلبُل سنائیں گے
یکجا کئے ہیں باغ میں جو غنچہ ہائے دہر
اب امتزاجِ خوشبوءِ گلشن دکھائیں گے
جب ساقی سب صورتِ بدرِ منیر ہوں
پھر کیوں نہ ظلمتوں کو بھی یکسر مٹائیں گے
جو امتیاز رنگ و بُو میں کھو گئے ہیں شادؔ
سب کو بُلا کے سینہ سے سینہ ملائیں گے

سہیلؔ لون

دل ہے پتھر نہ آنکھ پتھر کی
یہ ہیں سب سختیاں مقدر کی
کسی طوفاں کا پیشِ خیمہ ہے
مجھ میں یہ خامشی سمندر کی
ٹوٹنے سے جو بچ گیا ہوں میں
یہ عنایت ہے دیدۂ تر کی
ٹوٹ جانا تھا آئینہ اک روز
کیا ضرورت پڑی تھی ٹھوکر کی
ہم سزاوارِ زندگی ٹھہرے
بات پوری ہوئی ستم گر کی
جان دے کر سہیلؔ اُس کے لیے
آبرو عشق کی اُجاگر کی

شائق نصیرآبادی

کسی سے تلخ لہجے میں کبھی نہ گفتگو کرنا
جہاں تک ہو سکے دنیا میں زخموں کو رفو کرنا
طہارت ہر عبادت کے لئے جب کہ ضروری ہے
تو پھر ماں باپ کی خدمت بھی ہو کر باوضو کرنا
اگر کوئی بات تم پوچھو یا کوئی بات وہ پوچھیں
بہت ہی نرم لہجے میں ادب سے گفتگو کرنا
کوئی ماں باپ کے بارے اگر انگلی اٹھائے تو
کبھی تصدیق کی جرائت نہ کوئی جستجو کرنا
نصیحت ہے مری شائقؔ تجھے خواہ کچھ بھی ہو جائے
گلہ کرنا نہیں ماں سے شکایت تک نہ تُو کرنا

ایک پرانی غزل دیا جیم

پھر سے دیّا جلانے کا اک سلسلہ کرو
عالم ہے حیرتوں کا تو منظر جدا کرو
میری نگاہ بن کے نظر میں رہا کرو
کہتے ہیں جو بھی لوگ تو کہنے دیا کرو
بن کر لہو اترتی ہیں آنکھوں میں حسرتیں
کس نے کہا یہ تم سے کہ یوں رتجگا کرو
خونِ جگر سے سینچا ہے فصلِ امید کو
موسم ہو سازگار سبھی یہ دعا کرو
یہ کیا کہ تھک کے کہتے ہو جینا نہیں مجھے
تھک جائے گی یہ زندگی تم حوصلہ کرو

ناصرہ زبیری

سُن نہ پائے وہ مری بات ہی پُوری شاید
یہ کہانی بھی چلے آگے اُدھوری شاید

مختصر دورِ تسلّط تھا کہ میرے دل پر
اُس نے چاہی تھی حکومت ہی عبوری شاید
ناپنے ہجر مسافت کو چلی دل کی کرن
اُس اِکائی سے جہاں سال ہے نوری شاید
بے ارادہ کئی راہوں پہ چلا دل لیکن
ایک جانب ہے سفر میرا شعوری شاید
اُن کو تفصیل ہر اک بار بتا کر سوچا
رہ گئی بات مری سب سے ضروری شاید
منتظر آنکھ سے ہے خون ٹپکنے والا
رنگ لانے کو ہے اک عمر کی دُوری شاید
غالباً یاد نہیں تان رانجھے کو
گوندھنا بھول گئی ہیر بھی چوری شاید
اس نے ہر جیب ٹٹولی جو نکل کر گھر سے
بھول آیا ہے کوئی چیز ضروری شاید

جوشؔ ملیح آبادی

وفا کے پیمان سب بھلا کر
جفائیں کرتے وفا کے قاتل
رُسول حق کے جو اُمتی ہیں
وہی ہیں آل عباد کے قاتل
یہ اس کی اپنی ہی مصلحت ہے
وہ جسم رکھتا نہیں ہے ورنہ
یہ منصبوں کے غصب کے عادی
ضرور ہوتے خدا کے قاتل
نہ ہی امانت نہ ہی دیانت
نہ ہی صداقت نہ ہی شرافت
نبی کے منبر پر آگئے ہیں
نبیؐ کی ہر اک ادا کے قاتل
امام جن کا یزید ہوگا
وہ کیسے جانیں حسین کیا ہے
بنے بھی ہیں قاری لا الہ کے
یہ لا الہ کی بقا کے قاتل
یہ منصبوں کے غصب کے عادی
ضرور ہوتے خدا کے قاتل

عبدالحمید حمیدی کنیڈا

شہرِ سنسان میں یہ کیسی جگہ پائی ہے
اک کواڑوں کی صدا ملنے مجھے آئی ہے
یہ مستعار کی صدیاں بھی اب تو بیت چلیں
پلٹ ہی جائے گی وہ چیز جو پرائی ہے
نظارہ کیسے ہوا ہوگا خالی نظروں سے
وہ اور آنکھ ہے جو اُسکو دیکھ پائی ہے
یہ قافلہ جو رُکے گا تو پھر رواں ہوگا
کچھ ایسی رَمز اَزل سے قرار پائی ہے
ہے کوئی ہاتھ جو روکے چمن میں گلِ چیں کو
زبانِ حال سے کلیوں کی یہ دُہائی ہے
وہ سارے خواب پرانے تو کب کے ٹوٹ چکے
بہار ساتھ نئے خواب لے کے آئی ہے

پنجابی کلام
اطہر حفیظ فراز

گُج دل کملے دی غلطی سی
گُج پُٹھے سوچ دے راہ ہو گئے
گُج سجناں وی نہ ترس کیتا
گُج اپنے آپ تباہ ہو گئے
جو پائے سن ہار سجاوٹ لئی
اوہ اُلٹا گل دا پھاہ ہو گئے
لیا چکر مقدراں انج کیتی
اسیں اُجڑ گئے اوہ شاہ ہوگئے

امجد مرزا امجدؔ

شہر سُونا ہی کر گیا جیسے
کوئی لمبے سفر گیا جیسے
غم کا سایہ گزر گیا جیسے
بوجھ سر سے اُتر گیا جیسے
نذر جانِ عزیز یوں کر دی
دل ہی دنیا سے بھر گیا جیسے
یوں لگا اپنی داستاں لکھ کر
خامہ حد سے گزر گیا جیسے
اُنکو احساس ہو گیا میرا
اب مقدّر سنور گیا جیسے
یوں رکھا ہاتھ اُنہوں نے سینے پر
دل کا ناسُور بھر گیا جیسے
وہ جوانی کا جوش، اے امجدؔ!
چڑھ کے دریا اُتر گیا جیسے

حسن عباسی

مرتی ہوئی زمیں کو، بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے
وہ کر نہیں رہا تھا، میری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے
بھولے سے میری سمت کوئی دیکھتا نہ تھا
چہرے پہ ایک زخم لگانا پڑا مجھے
اس اَجنبی سے، ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے
یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فروخت بھی
اس گھر کی دیکھ بھال کو، جانا پڑا مجھے
اس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار

کل آئینے پہ، ہاتھ اُٹھانا پڑا مجھے
ایسے بچھڑ کے اس نے تو مر جانا تھا حسنؔ
اس کی نظر میں خود کو، گرانا پڑا مجھے

انشاء جی

یہاں اُلجھے اُلجھے رُوپ بہت
پر اصلی کم، بہرُوپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رُکنا
جہاں سایہ کم ہو، دُھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سُکھ کی چھاؤں میں
کیوں تیری آنکھ سوالی ہے؟
یہاں ہر اِک بات نرالی ہے
اِس دیس بسیرا مت کرنا
یہاں مُفلس ہونا گالی ہے
جہاں سچے رشتے یاریوں کے
جہاں گھونگٹ زیور ناریوں کے
جہاں جھرنے کومل سُکھ والے
جہاں ساز بجیں بن تاروں کے
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سُکھ کی چھاؤں میں

مبارک صدیقی

وہ جسے میں نے دل و جان سے چاہا، آہا
اُس نے بھی ایک مرا شعر سراہا، آہا
کوچۂ یار کے آزار بھی سُکھ ہوتے ہیں
اس نے رکھا جو میرے زخم پہ پھاہا آہا
کون ساقی ہے سرِ بزم، شرابوں جیسا
میکدہ بول اُٹھا جھوم کے، آہا، آہا
اُسکی پھولوں سی عنایت کے تو کیا کہنے ہیں
اُس کے پتھر پہ بھی دل میرا کراہا، آہا
کل وہ کہتا تھا مجھے شعر بُرے لگتے ہیں
آج جو سُن کے غزل کہتا ہے آہا، آہا
اپنے اعمال جو دیکھوں تو ندامت اُف اُف
تیری بخشش کو جو دیکھوں تو اِلٰہا، آہا
یار نے جو بھی کہا، دل نے کہا بسم اللہ
یوں مبارکؔ نے ہے اِک عشق نبھاہا، آہا

عاصی صحرائی

عجب ہی رنگ دکھلاتی ہے عاصیؔ
محبت ہے ہی قربانی کی پیاسی
بہت یہ جھومتی اور ناچتی ہے
سینہ تانتی ہے، بولتی ہے
سینے سے لگایا اس کو جس نے
زمانے بھر کے وہ سنتا ہے طعنے
محبت خود ہی سُولی ہی ہے پیارے
دکھائے یہ شہادت کے نظارے
محبت اک شجر ہے، با ثمر ہے
عاشق کی اسی پر ہی نظر ہے
محبت ہی ہے دریا کی روانی
آنکھوں میں بھی یہ نمکین پانی
یہی تو نیند میں ہے خواب جیسے
یہی معشوق کے کوچے میں ناچے
سبھی کو یہ مگر ملتی نہیں ہے
جفا کی راہ پر چلتی نہیں ہے
خدا کی راہ میں ہے یہ سنورتی
نبی ﷺ کے فیض کو ہے دامن میں بھرتی
عاصیؔ یہ عجب ہے شے نرالی
اسی کے در کے ہیں ہم بھی سوالی

مزاحیہ نظم

آفتاب اختر

لکھ رہا ہوں اک شکایت آج اپنی نظم میں
ملتمس ہوں اسے پڑھے کوئی عورتوں کی بزم میں
میں ہوں شوہر کسی عورت پردہ دار کا
شہر کی لجنہ میں اک مصروف عہدیدار کا
اگرچہ خاوند ہوں مگر خاوند کم اَب محکوم ہوں
اہلیہ کے دستِ لذّت سے ہو محروم ہوں
اپنے دل کی کیفیت میں جانتا ہوں باخدا
سال سے کھایا نہیں کچھ خاص ان کے ہاتھ کا
جو بھی مِل جائے مجھے بصد شکر کھالیتا ہوں
اُن کا کہنا ہے بہت اچھا پکا لیتا ہوں
مری دِل جوئی کو اُن کے پاس کچھ معجون ہیں
کچھ حکایات صحیفہ اُن سے مضمون ہیں
ناز اپنی اہلیہ کے جو یہاں اُٹھائے گا
وہ بشر روزِ حشر جنت میں سیدھا جائے گا
اَب تو اختؔر زندگی میں کچھ تغیر چاہئے
ایک بیوی گھر کے اندر اور ایک باہر چاہئے

مسعود چودھری جرمنی

صبح کا اُجالا سویرا شام میں رکھنے لگے
مرکزی کردار کو انجام میں رکھنے لگے
میں بھی اپنی ذات میں گویا کوئی فرعون تھا
بعد مرنے کے مجھے اہرام میں رکھنے لگے
نام جب میرا نہیں لکھا تھا فردِ جُرم میں
شہر والے کس لئے الزام میں رکھنے لگے
قافلہ سالار ایسے بھی ملے رہ میں ہمیں
قافلے کو جادہء سا لار میں رکھنے لگے

بادشاہِ وقت کے جتنے مقرب تھے، وہ آج
ہم چھپا کر تحفہ و انعام میں رکھنے لگے
میکدے میں جس کو دیکھو مستیوں میں چُور ہے
کون سا ایسا نشہ وہ جام میں رکھنے لگے
جنسِ بے مایہ کی صورت ان کا لہجہ ہوگیا
جو حقائق کو خیالِ خام میں رکھنے لگے
کل پسِ زنداں جنہیں آتا تھا ہنر
آج وہ پنچھی انہی کو دام میں رکھنے لگے
رابطہ مسعودؔ اب ہم اُن سے رکھ سکتے نہیں
جو عداوت پیار کے پیغام میں رکھنے لگے

بھکاری

کسی شخص نے ایک بھکاری سے پوچھا کہ ''کیا تم نے بھیک مانگنے کے لئے بھی اصول بنا رکھے ہیں''۔''باالکل ہمارے اصول ہیں'' بھکاری نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا''ہر چیز مانگو، ہر وقت مانگو، ہر کسی سے مانگو''

پٹاخے

نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔کہ خوشی کا پُر جوش مظاہرہ کرنے کے لئے پٹاخے چھوڑنا اور آتشبازی چلانا انسان کی جبّلت ہے۔ شروع شروع میں درندوں کو ڈرانے کے لئے پٹاخے اور آتشبازی ایجاد ہوئی۔لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگے تو یہ پٹاخے اور آتشبازی گولوں، بموں، جدید اسلحہ کی شکل اختیار کر گئیں۔

محبت

میں جانتا ہوں کہ محبت اندھی ہوتی ہے لیکن یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ محبت کرنے والے بھی اندھے ہوتے ہیں۔ بالخصوص آج کل کے محبت کرنے والے...وہ تو محبوب یا محبوبہ کے علاوہ اس کے پس منظر میں کوٹھی، کار، جہیز، اور بینک بیلنس تک سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔اس لئے میں کہتا ہوں کہ آنکھ محبت کا پہلا دروازہ ہے۔

شگوفے

وقت۔وقت روز اوّل سے اب تک اپنی ایک رفتار سے چلتا آرہا ہے۔اس پر کسی کا زور نہیں ہے۔انسان تمام چیزوں کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔مگر وقت اور موت کو نہیں۔ یہ آتا ہے اور خاموشی سے چلا جاتا ہے۔سمجھدار لوگ وقت کی اہمیت جان جاتے ہیں۔جبکہ ناسمجھ لوگ اس کی اہمیت کو اس وقت جان پاتے ہیں جب وہ گزر جاتا ہے۔وقت بے حد ظالم ہے۔اپنے آگے چلنے والوں کو اور پیچھے رہ جانے والوں کو بُری طرح روند ڈالتا ہے۔گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

کھوتی۔گدھی

کھوتی پنجابی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھوتی ہی ہیں۔کھوتی کو اردو میں گدھی، انگلش میں ڈنکی اور پشتو میں بہت کچھ کہتے ہیں۔کھوتی کی دولتیاں لگنے سے کافی چوٹ لگتی ہے۔شاید اسی لئے ڈنکے کی چوٹ والا محاورہ معرض وجود میں آیا۔کھوتی دنیا کا سب سے مظلوم جانور ہے۔جتنا کام کھوتی سے لیا جاتا ہے اگر اتنا کام سیاستدان کرتے تو ہمارا ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا۔کھوتی دیہاتوں کا قومی جانور ہے۔ دیہات میں اگر کھوتی نہ ہوتی تو دیہات نہ ہوتے۔کھوتی سے مختلف کام لئے جاتے ہیں، بلکہ صرف کام ہی لئے جاتے ہیں۔کھوتی کے اہم کاموں میں ریڑھی کھینچنا، چارا، لانا، گندم پسوانا وغیرہ شامل ہیں۔کھوتی کی پیداوار پاکستان میں باقی ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اگر پاکستان صرف کھوتی کی برآمد شروع کردے تو ملک دن دگنی رات چگنی ترقی کرسکتا ہے۔ کھوتی اور جمہوریت میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے فرق ہے تو بس اتنا کہ کھوتی ڈنڈا لگنے پر چل پڑتی ہے۔ کھوتی کا واحد سودمند استعمال گالی میں کیا جاتا ہے۔اگر اللہ میاں کھوتی پیدا نہ کرتے تو دنیا ایک قیمتی گالی سے محروم رہ جاتی۔کھوتی کافی ڈھیٹ ہوتی ہے کھوتی کی ڈھیٹ نیس کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے کہ کھوتی ہمارے سیاستدانوں سے صرف 10 فیصد کم ڈھیٹ ہوتی ہے۔کھوتی کے پاس واحد ہتھیار دولتی ہوتی ہے کھوتی اپنی دولتی کا استعمال خوب سوچ سمجھ کر کرتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کھوتی کی دو آنکھیں پیچھے کی طرف بھی ہوتی ہیں کیونکہ کھوتی اپنی دولتی مرد کے انڈر گراؤنڈ سسٹم پر ایسے مارتی ہے کہ بغیر دیکھے ایسا نشانہ ناممکن ہے۔ہمارے پیارے ملک میں کچھ مقامات پر کھوتی کی بریانی بھی دستیاب ہے۔لیکن ان مقامات پر پولیس کا سخت پہرا ہوتا ہے۔کھوتی کی کھال بہت مضبوط ہوتی ہے لیکن لوگ صرف ضد کی وجہ سے کھال کا کچھ نہیں بناتے۔کھوتیاں چارا اور مار بہت رغبت سے کھاتی ہیں۔کھوتیوں اور انسانوں میں واحد مماثلت یہ ہے کہ ان کے بھی صرف بچے پیارے لگتے ہیں۔سنا ہے پرانے وقتوں میں کھوتی کے سینگ ہوتے تھے لیکن ڈائنوسور جاتے جاتے سینگ بھی ساتھ لیتے گئے۔اس دن کے بعد سے آج تک کھوتیاں سینگ نہ ہونے کا طعنہ سن رہی ہیں۔مختلف ملکوں میں کھوتی کی الگ پہچان ہے مثلاً سعودی عرب میں کھوتی، عربی مارنے کے کام آتی ہے۔افریقن کھوتی برداشت کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی ہے اور پاکستانی کھوتی بیویوں کا غصہ اتارنے کے کام آتی ہے۔

***

غیر ملکی دباؤ

لیگی حکومت جاتے جاتے کشمیر کے عبوری آئین میں ترمیم کرا گئی؟؟؟

مسلم لیگ ن حکومت کی جانب سے اقتدار کے آخری روز

ابن لطیف

ملکی مفاد کو پس پشت ڈالتے ہوئے عالمی طاقتوں کے مطالبے پر آزاد جموں و کشمیر عبوری آئین 1974ء کے ترمیمی بل کی منظوری دی گئی۔ تھرڈ شیڈول میں ترمیم کے ذریعے پاکستان کو آزاد کشمیر کے تمام مالی وانتظامی معاملات اور اختیارات سے الگ کر دیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر حکومت کو اپنے کرنسی نوٹ جاری کرنے، غیر ملکی امداد، خارجہ امور، تجارت، مواصلات، نیوکلیئر انرجی کی پیداوار کیلئے معدنیات کا استعمال اور نیوکلیئر فیول کی پیداوار کا اختیار دیدیا گیا ہے۔ ترمیمی بل کے ذریعے کشمیر کونسل تحلیل اور آزاد کشمیر میں امن وامان کے قیام سمیت تمام امور میں پاکستانی اختیارات ختم کر دیئے گئے۔ سابق وزیراعظم شاہد خاقان عباسی کے پرنسپل سیکرٹری کی ہدایت پر راتوں رات سمری تیار کر کے 31 مئی کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں پیش کی گئی۔ حساس ادارے نے تحریری طور پر ترمیمی بل کو ملکی مفاد کے منافی اور مسئلہ کشمیر کیلئے نقصان دہ قرار دیا۔ وزارت دفاع سمیت تمام سٹیک ہولڈرز کی آراء حاصل کئے بغیر سمری 31 مئی کو وفاقی کابینہ سے منظور کروائی گئی۔ وفاقی سیکرٹری وزات امور کشمیر و گلگت بلتستان نے آزاد کشمیر میں آئینی وانتظامی اصلاحات ترمیمی بل کو ملکی مفاد کے منافی قرار دیا۔ آزاد کشمیر میں اصلاحات کیلئے ترمیمی بل فنانشل ایکشن ٹاسک فورس کو بھی ارسال کیا گیا ہے۔ اصلاحات کے نام پر آزاد کشمیر کو خودمختار ریاست بنانے اور تحریک آزادی کشمیر کو ناقابل نقصان پہنچایا گیا۔ رولز آف بزنس کے سیکشن 18 کی ذیلی شق 4 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نیشنل سکیورٹی کونسل سے حتمی ڈرافٹ کی منظوری حاصل نہ کی گئی۔ مسلم لیگ ن کی حکومت کے اقدام کو اسلام آباد ہائیکورٹ میں چیلنج کر دیا گیا ہے اور جسٹس عمر فاروق نے اٹارنی جنرل کو نوٹس جاری کرتے ہوئے 2 ہفتوں میں جواب طلب کر لیا ہے۔ 92 نیوز کو موصول وزارت امور کشمیر، کابینہ ڈویژن کی سرکاری دستاویز اور پٹیشن کی کاپی کے مطابق مسلم لیگ ن کی حکومت نے 31 مئی کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں خلاف ضابطہ آزاد جموں و کشمیر عبوری آئین میں ترمیم کی سمری منظور کی جس کے نتیجے میں کشمیر کونسل تحلیل اور دفاع، خزانہ، امن وامان اور توانائی سمیت دیگر اہم امور میں وفاقی کابینہ اور صدر مملکت کے اختیارات ختم کر دیئے گئے۔ 26 مئی کو اسلام آباد ہائیکورٹ کے حکم امتناع کے باعث ترمیم بل موخر کر دیا گیا مگر 31 مئی کو نئے بل پر مشتمل سمری وفاقی کابینہ اجلاس میں پیش کر دی گئی۔ ترمیمی بل کی منظوری کے بعد یکم جون کو آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی میں بل پیش کر کے کچھ مزید ترامیم کے ساتھ بل منظور کروالیا گیا۔ ترمیمی بل کے نتیجے میں پاکستانی ڈومیسائل کے حامل تمام افراد اور افسران کے آزاد کشمیر میں حقوق ختم کر دیئے گئے ہیں۔ عبوری آئین میں ترمیم کے بعد پاکستان صرف آزاد کشمیر کو سالانہ اربوں روپے بجٹ فراہم کریگا مگر پاکستان کو آزاد کشمیر میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ آزاد کشمیر حکومت کو پاکستان کو اپنی فضائی حدود استعمال کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیدیا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق بھارتی اور عالمی طاقتوں کے لابسٹ نے نواز شریف کو قائل کیا۔ نواز شریف کی ہدایت پر 2016ء میں آزاد جموں و کشمیر عبوری آئین میں اصلاحات کے نام پر ترمیم کے منصوبے پر کام شروع کیا گیا مگر 27 اپریل 2017ء کو معروف بھارتی بزنس مین سجن جندال کے دورے کے بعد اس معاملے کو حتمی شکل دے کر وزارت امور کشمیر اور دیگر سٹیک ہولڈرز کو قائل کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کی جانب نواز شریف کی نااہلی کے بعد عالمی طاقتوں کے اس منصوبے کو دھچکا لگا تاہم اپریل 2018ء میں اس پلان کو منطقی انجام تک پہنچانے پر دوبارہ کام شروع ہوا جس کی بالآخر تمام قواعد وضوابط رکھتے ہوئے ملکی مفاد کے منافی 31 مئی کی رات 10 بجے تکمیل کی گئی۔ درخواست گزار کے وکیل بیرسٹر عمار سہری نے اسلام آباد ہائیکورٹ سے 31 مئی کا وفاقی کابینہ کا فیصلہ اور نوٹیفکیشن کالعدم قرار دینے اور ملکی مفاد کے منافی آزاد کشمیر کے عبوری آئین میں ترمیم کے کرداروں کا تعین کرنے کیلئے جے آئی ٹی تشکیل دینے کی سفارش کی ہے۔ بیرسٹر عمار سہری کے مطابق نواز شریف نے اقتدار کے حصول کیلئے بھارتی ودیگر عالمی طاقتوں کے ایما پر آزاد کشمیر کے عبوری آئین میں حکومتی مدت ختم ہونے کے آخری دن ترمیم کرائی۔ نواز شریف اور مسلم لیگ ن کی حکومت کی اس اقدام کے باعث ملکی سلامتی کو داؤ پر لگایا گیا ہے۔

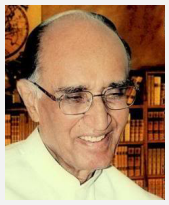

مشتاق احمد یوسفی

شادی

* ۔ بی۔اے کے نتیجے سے اس قدر بد دل ہوئے کہ خودکشی کی ٹھان لی۔ بوڑھے والدین نے سمجھایا کہ بیٹا خودکشی نہ کرو، شادی کر لو چنانچہ شادی ہوگئی۔
(نثار نندوانی مشتاق احمد یوسفی)

* ۔عورتیں پیدائشی محنتی ہوتی ہیں۔اس بات کا اندازہ آپ اس بات سے لگا لیں کہ صرف 12 فیصد خواتین خوبصورت ہوتی ہیں، باقی سب اپنی محنت سے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔دوزخ میں گنہگار عورتوں کو ان کے اپنے پکائے ہوئے سالن زبردستی کھلائے جائیں گے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔یہ بڑی کمزوری ہے کہ اپنی ٹیم کسی کھیل میں جیت جائے تو اسے قومی کھیل سمجھنے لگتے ہیں اور اس وقت تک سمجھتے رہتے ہیں جب تک کہ ٹیم دوسرا میچ ہار نہ جائے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔کسی زمانے میں راجپوتوں اور عربوں میں لڑکی کی پیدائش نحوست اور قہرِ الٰہی کی نشانی تصور کی جاتی تھی۔ان کی غیرت یہ کیسے گوارہ کر سکتی تھی کہ ان کے گھر بارات چڑھے۔داماد کے خوف سے وہ نوزائیدہ لڑکی کو زندہ گاڑ آتے تھے۔ قبلہ اس وحشیانہ رسم کے خلاف تھے۔وہ داماد کو زندہ گاڑنے کے حق میں تھے۔
(مشتاق احمد یوسفی)

* ۔الفاظ سے بات سمجھ آتی ہے لہجے سے دل میں اُتر جاتی ہے۔جادو الفاظ میں نہیں، لہجے میں ہوتا ہے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔ہماری فلموں میں آج بھی اگر غلطی سے ہیرو کا کرتا بھی ہیروئن کی انگلی کو چھو جائے تو وہ گز بھر اُونچی چھلانگ لگا کے چیختی ہے ''جان کدھ لئی بے ایمانا'' اور نزدیک ترین درخت کے تنے سے بغل گیر ہوجاتی ہے۔پھر ہیرو انگلی پکڑتے پکڑتے انگوٹھی پہنا دیتا ہے۔اس کے بعد انگریزی محاورے کے مطابق They live Happily ever after (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔شعر میں جس بات پر ہزاروں آدمی مشاعروں میں اُچھل اُچھل کر داد دیتے ہیں، وہی بات اگر نثر میں کہہ دی جائے تو پولیس تو بعد کی بات ہے، گھر والے ہی سر پھاڑ دیں گے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔ہماری رائے میں کسی پڑھی لکھی عورت کے لئے اس سے سخت اور کونسی سزا ہوسکتی ہے کہ اسے چالیس دن تک اُسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلایا جائے۔ دُبلا ہونے کا اس سے بہتر اور زود اثر طریقہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔
(مشتاق احمد یوسفی)

* ۔یوں میرا دادا بڑا جلالی تھا۔اس نے چھ خون کئے۔اور چھ ہی حج کئے۔ پھر قتل سے توبہ کر لی۔کہتا تھا اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔اب مجھ سے بار بار حج نہیں ہوتا۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔کچھ لوگ اتنے مذہبی ! ہوتے ہیں کہ جُوتا پسند کرنے کے لیے بھی مسجد کا رُخ کرتے ہیں۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں۔مگر عورتیں اس لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں کہ انہیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔محنت کر کے اپنے زورِ بازو سے باعزت طریقے سے فیل ہونا، نقل کر کے پاس ہونے سے بدرجہا بہتر ہے! (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔اس زمانے میں ایر کنڈیشننگ عام نہیں تھی۔صرف ہسپتالوں کے آپریشن تھیٹرز ایر کنڈیشنڈ ہوتے تھے لیکن اس سے مستفید ہونے کے لئے پہلے بے ہوش ہونا ضروری تھا البتہ سینما ہال میں یہ شرط نہیں تھی۔لہٰذا رمضان کے مہینے میں کوئی فلم قضا نہیں ہوتی تھی۔اس عمل کو روزہ بہلانا کہتے تھے۔ضمیر جعفری کہتے تھے کہ آپ لوگ فلم کو چٹنی کی طرح استعمال کرتے ہیں، جب کہ محمد جعفری فرماتے تھے کہ ایسے ویسے سین کے بعد اگر تین مرتبہ قراءت سے لاحول پڑھ لی جائے تو معافی و مغفرت کی صورت پیدا ہوسکتی ہے۔وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔
(مشتاق احمد یوسفی)

* ۔ڈاکٹر کی دُعا اور بیوی کی چُپ کبھی اچھا شگون نہیں رہا۔
(مشتاق احمد یوسفی)

* ۔فیمی نسٹ خواتین سے ڈر لگتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ ان سے اختلاف کیا جائے تو خفا ہوجاتی ہیں۔اگر متفق ہو جائیں تو اور زیادہ خفا ہوجاتی ہیں۔
(مشتاق احمد یوسفی)

* ۔وہ زہر دے کے مارتی تو دُنیا کی نظر میں آجاتی۔اندازِ قتل تو دیکھو ہم سے شادی کر لی۔ (مشتاق احمد یوسفی)

* ۔انہیں یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا کہ حلوائی اور بچے اس کتے کو ٹیپو ٹیپو! کہہ کر بلا اور دھتکار رہے تھے۔سرنگا پٹم کی خون آشام جنگ میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے کثرت سے کتوں کا نام ٹیپو رکھنا شروع کر دیا تھا۔اور ایک زمانے میں یہ نام شمالی ہندوستان میں اتنا عام ہوا کہ خود ہندوستانی بھی آوارہ و بے نام کتوں کو ٹیپو کہہ کر ہی بلاتے اور پکار کرتے تھے۔یہ جانے بغیر کہ خود کتوں کا یہ نام کیسے پڑا۔باستثنائے نپولین اور ٹیپو سلطان، انگریزوں نے ایسا سلوک اپنے کسی اور دشمن کے ساتھ روا نہیں رکھا۔اس لئے کہ کسی اور دشمن کی ان کے دل میں ایسی ہیبت اور دہشت کبھی نہیں تھی۔برصغیر کے کتے سو سال تک سلطان شہید کے نام سے پکارے جاتے۔کچھ برگزیدہ شہید ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی آزمائش، عقوبتِ مطہرہ، اور شہادت عظمیٰ ان کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔رب جلیل انہیں شہادتِ جاریہ کی سعادت سے سرفراز فرماتا ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

* ۔اگر سکھ چاہو تو جوانی میں بہرے بن جاؤ اور پڑھاپے میں اندھے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

اعجاز احمد قریشی

تم آئے بھی تو کیا ہوا ملے بغیر چل دیئے
سکونِ دل ہولے گئے غموں کو دے کے چل دیئے

غنچۂ دل تھا کھل اُٹھا تیرے خیالِ ناز سے
کھلتا ہوا حریمِ جاں خزاں ہو کر کے چل دیئے

یہ اِضطراب کی گھڑی مجھے ہی سہنی ہے پڑی
خوشی جو لمحہ بھر ملی اُسے بھی لے کے چل دیئے

دستِ سوال ہے دراز پوچھا کبھی نہ میرا حال
کوچۂ دل کے آس پاس آئے کبھی تو چل دیئے

ہے دوستوں سے کیا گلہ چھُٹ گئے سبھی ہیں وہ
ہے ریت یہ زمانے کی کہ چھوڑ کر ہیں چل دیئے

اِک سما تھا چاہا جب آنکھ لڑائی چل دیئے
اِک سما ہے آج یہ آنکھیں بچا کے چل دیئے

ہیں عالی ظرف پھر بھی وہ گزرے جو میرے پاس سے
اعجازؔ دیکھ کر مجھے وہ مُسکرا کے چل دیئے

پکّی قبر - مبشرہ ناز

جب سے ماں جی فوت ہوئی تھیں آج پہلی بار خواب میں آئیں... میرے بالکل پاس ہی بیٹھی بتا رہی تھیں کہ...آج پھیکے کی اماں سے ملنے گئی تھی...پھیکے نے اُن کے لئے بہت سوہنا پکا گھر بنوایا ہے اور اُن کے صحن میں بہت خوبصورت پھل دار درخت بھی لگوائے ہیں...اور پھر میری آنکھ کھل گئی...پھیکے کی اماں کو گزرے بھی کئی سال ہو گئے۔...بہت اچھا خواب تھا...سوچا پھیکا آئے گا تو اس کو بتاؤں گا...! پھیکا دو دن سے گاؤں آیا تو ہوا تھا...لیکن ابھی تک ملنے نہیں آیا۔...جانے کن کاموں میں مصروف تھا...ابھی میں اُس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ چلا آیا...دل کو شاید دل سے راہ ہونے لگی تھی..وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا...مگر چہرے پر ہمیشہ کی طرح بلا کا سکون...! ہاں بھئی پھیکے کدھر تھے یار...؟ میرے پوچھتے ہی ایسا لگا جیسے کمرے کی دیواریں بھی قریب قریب کھسک آئیں ہوں۔...وہ بھی پھیکے کی باتیں سننے کے لیئے بیچین تھیں... پھیکے کے جانے کے بعد ہواؤں میں بھی دعائیں گھلی ہوئی محسوس ہوتیں...! پھیکا کہنے لگا صاحب جی کیا بتاؤں...؟ دو تین دن پہلے کام سے کار آ رہا تھا کہ راستے میں بس خراب ہو گئی...بڑی ظالم دوپہر تھی صاحب جی...! گرمی شدید... نہ کوئی بندا تھا نہ بندے کی ذات...پیاس سے برا حال...سارے مسافر بلک رہے تھے...عجیب چمکتی ہوئی دھوپ تھی پل بھر کو لگتا نئی نویلی دلہن کی مانگ میں سیندور چمک رہا ہے... اور سنسان ایسی صاحب جی...جیسے ابی کے گزر جانے کے بعد اماں کا چٹا اُجڑا سر...پہلی بار گرمی کی دوپہر کے ساتھ اس طرح کی ملاقات ہوئی تھی صاحب جی...بہار نے نوحہ لکھ بھیجا تھا جیسے...ایک ہی اکلوتا درخت تھا...جس کے نیچے ہم سب مسافر بیٹھ گئے...

دھرتی نے جویں اِکو ہی پُتر جنما تھا جی...اُس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بہت سکون تھا صاحب جی...میری حالت تو ایسی تھی جیسے چڑی کے بوٹ کو آہلنے سے گرنے کے بعد اچانک کوئی مہربان اُٹھا کر واپس رکھ دے... یا کسی روتے بچے کو ماں بُکل میں چھپا لے...بڑا یاد آئی تھی صاحب جی...ماں اوس ویلے...ماں جیسا وڈا جگرا تھا جی اُس درخت کا...اُس نے سب کو اپنی

چھاؤں میں سمولیا تھا... بڑا شکر ادا کیا جی میں نے سوہنے اللہ کا... درخت کے نیچے ہم مسافر بیٹھے تھے... اور اوپر پرندے... کئی گھنٹے ہم سب اُدھر اُڈیکتے رہے... پھر کدرے جا کر دوسری بس آئی... اور اللہ اللہ کر کہ ہم گھر پہنچے...!

صاحب جی تھوڑے سے پیسے جمع کیئے ہوئے تھے کہ اماں کی قبر پکی کرواؤں گا... پھر میں نے ارادہ بدل دیا.. قبر تو قبر ہی ہے نا کچی ہو یا پکی اماں کو کیا فرق پڑنا ہے... وہ تو رب کے پاس چلی گئی... پر جیوندے جی جو ہیں نا اُن کا زیادہ حق ہے صاحب جی...! اُن پیسوں سے میں نے بُوٹے خریدے ساتھ یار بیلی بُلائے اور لگانے شروع کر دیئے... سب سے پہلے اماں کی قبر پر بڑا سوہنا امرود کا درخت لگایا اور پھر پنڈ آنے والی سڑک پر کتنے ہی درخت لگائے... اور اس کے علاوہ صاحب جی سارے یار بیلیوں کی ڈوٹی لگادی کہ لاری اڈے پر مسافروں کو ٹھنڈا پانی پلائیں... صاحب جی صبح چھیدے حلوائی اور اس کے بیٹوں کی ڈوٹی تھی پھر جی پھّے اور اس کے پراوسیم کی... اور اب مَیں نِکے کے ساتھ دو گھنٹے مسافروں کو پانی پلا کر آیا ہوں... صاحب جی باہر تتی دوپہر تھی اور میرے اندر مگھر پوہ... اُس دن کی گرمی نے تو میرے ہوش اُڑا دیئے تھے جی... اللہ بھلا کرے صاحب جی میرے کہنے پر سارے یار بیلی میرے ساتھ لگ گئے اب کل کم پر واپس شہر جانا ہے... سوچا آپ سے مل کر آپ سے دُعا لیتا جاؤں... آپ کو بتائے بغیر تو نئیں نا جا سکتا تھا صاحب جی...! اماں کی قبر پکی نہیں کروا سکا... پھیکا کہتے کہتے رو پڑا...! وہ ایسا ہی تھا روتا اور رُلاتا... دل کی ساری گرہیں کھولتا جاتا...! اُس کی باتیں میرے دل پر گہرا اثر کرتیں تھیں... وہ اپنی کہانی سُنا کر چلا جاتا...! میری کہانی اُس کے جانے کے بعد شروع ہوتی... سوہنے ربّ سے دعائیں مانگتا... مجھے رنگ دے... پھیکے کے رنگ میں... کاش میں ہی پھیکا ہوتا...! اللہ نے پھیکے کو اچھے کاموں کے لیئے چُن لیا ہے... بس کا خراب ہونا اس کے لیئے نیکی کمانے کا نیا راستہ بنا گیا...! زحمت رحمت بن گئی تھی... ہر بار پھیکا بازی لے جاتا... میں نے اگلی صبح ہی پورے گاؤں میں درخت لگانے کا کام شروع کروا دیا... اور چُپ چپیتے بخشو کو پھیکے کی اماں کی قبر پکی کروانے کے لیئے بھیج دیا... میں حیران تھا... پھیکے کے ساتھ دل کو یہ کیسی راہ ہونے لگی تھی...؟ میری آنکھوں میں آئے شکرانے کے آنسو کل والے خواب کو بھگو رہے تھے...!

***

''پھیکا'' مبشرہ ناز

''پھیکا'' مُبشرہ ناز کا تخلیق کردہ ایک ایسا کردار ہے جو ہمارے معاشرے کی بیشمار تکلیفوں اور بیماریوں کی نہ صرف تشخیص کرتا ہے بلکہ ایک شفیق مسیحا کی طرح ہماری رُوح اور دِل و دماغ کو بڑے پیار سے سہلاتے ہوئے علاج بھی تجویز کرتا ہے۔ (فہیم احمد ندیم) اماں، وطن، لڑکی، درد اور ہوس۔ میں نے رب کو دیکھا تھا صاحب جی...! سچ مچ میں نے رب کو دیکھا تھا...! اپنی ان گنہگار آنکھوں سے صاحب جی...! وہ حساب کتاب کرنے آیا تھا...! پھیکا صبح صبح ہی ملنے آ گیا تھا اور آج یہ کیسی باتیں کر رہا تھا...! صاحب جی کل کام سے آ رہا تھا اسٹیشن پر پہنچا گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ تھی میں وہیں بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا... وہاں ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بھیک مانگ رہی تھی...! شکل صورت سیکسی طرح بھی بھیک مانگنے والی نہیں دکھتی تھی...! جانے کیا مجبوری اُسے سڑک پر لے آئی تھی صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلی بار گھر سے نکلی ہے... اُس کے چہرے پر بہت بے بسی تھی صاحب جی...! اتنے میں ایک آدمی...! ایک میرے اور آپ جیسے آدمی نے صاحب جی...! اس کو چند روپے پکڑائے اور پکڑاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو چھو لیا...! صاحب جی میں وہاں بیٹھا دیکھتا رہا...! میرے سامنے کئی مرد آئے اور اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے...! آوازیں کستے اور اس کے جسم کو مختلف طریقوں سے چھوتے یا چھونے کی کوشش کرتے...! وہ بیچاری چادر میں چھُپنے کی کوشش کرتی...! صاحب جی چادر کا بس نہیں چلتا تھا کہ چار دیواری بَن جاتی...! میں نے چادر کے بَین سُنے صاحب جی...! میں نے چادر کو چیخیں مار مار کر لڑکی کے ساتھ روتے دیکھا...! ایک شخص نے تو حد ہی کر دی...! صاحب جی لڑکی کے جسم کے ان حصوں کو چھوا جو اس کے عورت ہونے کی دلیل تھے...! جو اس کی مامتا کی نشانی تھے...! کیا عورت کے مقدس حصے جن سے وہ خونِ جگر پلا کر قوم کی نسلوں کی آبیاری کرتی ہے کیا اُن کی اِس سے زیادہ تذلیل ممکن ہو سکتی ہے...؟؟؟ میرے سامنے میری گُڈی کھڑی تھی صاحب جی...! ہاں صاحب جی...! ہائے صاحب جی...!

پھیکا بہت رو رہا تھا...! اس کا رُواں رُواں آہ و فُغاں کر رہا تھا اس قدر بے چین میں نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...! اور میں صاحب جی یوں شرمندگی سے اُس کی بات سن رہا تھا جیسے یہ سب کرنے والا میں تھا...! میں نے حادثے ہوتے دیکھے بھی تھے صاحب جی سنے بھی...! پر ایسا حادثہ پہلے کبھی نہیں دیکھا...! اتنا خون کبھی نہیں دیکھا صاحب جی جو اُس لڑکی کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ رہا تھا...! سارے ٹیشن پر خون ہی خون تھا...! صاحب جی اماں اُن

دنوں کے قصے سُنایا کرتی تھی۔۔۔! جب پاکستان بنا۔۔۔! کس طرح لوگوں کے گھر جلے کس طرح عزتیں لوٹی گئیں۔۔۔! بہت روتی تھی اماں اپنی پکّی سہیلی کو یاد کر کے۔۔۔! ظالم گِدھوں نے بری طرح اس کو نوچا اور اس کے مرنے کے بعد تک بھی نوچتے رہے۔۔۔! اماں کی بتائی ساری کہانی ٹیشن پر فلم کی طرح چلنے لگی میرا سارا وجود اکھاں بن گیا تھا صاحب جی اماں کی اکھیاں۔۔۔! صاحب جی سارا ٹیشن اس منظر سے بھر گیا چیخیں تھیں طوفان تھا لاشیں تھیں۔۔۔! صاحب جی اتنے گھاؤ تھے میرے جسم پر کہ پنڈا نیلو نیل خون وخون ہو گیا۔۔۔! پھیکا روتا جاتا اور کہتا جاتا۔۔۔! میں اور بخشوُ اس کے لفظوں کی اُنگلیاں تھامے اُس کے ساتھ ان لمحوں میں چلے جا رہے تھے گویا مر رہے تھے جاں بلب تھے۔۔۔! وقت کے نیزے کی انّی پر جسم اور رُوح کو دھرے ہم سب پھیکے کے ساتھ وطن کی خاطر جسم اور جاں پر لگے گھاؤ کھانے والوں کو دیکھ کر رو رہے تھے۔۔۔! پھیکا بولتا جا رہا تھا۔۔۔! صاحب جی میں چھوٹا سا تھا اِک واری جب میں نے کیلا کھا کر چھلکا سڑک پر پھینک دیا تو اماں نے مجھے بہت ڈانٹا۔۔۔! چھلکا اُٹھا کر پلّو میں باندھ لیا اور پھر رو پڑی۔۔۔! کہتی تھی پُتّر وطن کو گندہ مت کرنا بڑی قربانیاں دی ہیں ہم نے اس کی خاطر۔۔۔! صاحب جی مجھے اماں کی باتیں کبھی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔۔۔! اب اُس کے جانے کے بعد اُس کی ہر بات سمجھ آنے لگی ہے۔۔۔! صاحب جی اماں کی آنکھوں میں چھپا وہ درد اچانک میرے دل میں بھر گیا۔۔۔! اماں، وطن، لڑکی، درد اور ہوس کے رنگوں سے مل کر ایک بہت بھیانک تصویر بنی تھی۔۔۔! ایک لمحے میں وہ تصویر ہر گلی محلے میں لٹکی نظر آنے لگی۔۔۔! میرا وطن گندہ ہو رہا تھا صاحب جی۔۔۔! اور درد تیز سے تیز تر۔۔۔! میرے دل کی رگیں تنگ ہو کر بند ہونے لگی تھیں۔۔۔! صاحب جی وہ لڑکی وہیں موجود تھی۔۔۔! اُس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا اور وہ بُری طرح رو رہی تھی۔۔۔! میں نے پُکارا بیٹی۔۔۔! اس نے چونک کر عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اُس کے چہرے پر بہت بے یقینی تھی۔۔۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں رَبّ کو دیکھا اُس کی آنکھوں میں رب بیٹھا تھا صاحب جی۔۔۔! وہ میرا حساب لینے آیا تھا جیتے جی حساب کتاب شروع ہو گیا تھا۔۔۔! لڑکی روتے روتے کہنے لگی ''بیٹی کو تو کب کی بُھوک کھا گئی'' اس لڑکی کی آنکھوں میں یقین کا سورج غروب ہو رہا تھا۔۔۔! اور صاحب جی میں سورج ڈوبنے سے پہلے اُسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔۔۔! میں سمجھوں گا رب نے دو بیٹیاں دی تھیں جی۔۔۔! میں نے پھیکے کو گلے سے لگا لیا۔۔۔! آج پھر سے پاکستان بنا تھا۔۔۔! لُٹ لٹا کر قافلہ وطن پہنچا۔۔۔ اُسی شام کو بخشو نے اپنے بیٹے کے لیئے بہت عزت سے اُس بچی کا ہاتھ مانگ لیا۔۔۔ آج پھیکے کی بیٹی کا نکاح ہے۔۔۔! پھیکے نے سارا گند اپنے پلّو میں باندھ لیا تھا۔۔۔! اس نے وطن کو گندہ ہونے سے بچا لیا۔۔۔!

میں نے گورکن بابا سے پوچھا

بابا جی گناہ گاروں کی قبروں کا بھی کچھ احوال بتائیں:

بابا جی اُفسردہ لہجے میں بولے اب آدمی کی قبر تیار کرتے ہوئے بہت مشقت کرنا پڑتی ہے۔ قبر کی مٹی سخت ہوتی ہے تو کہیں پتھر قبر کی تیاری میں رُکاوٹ بن جاتے ہیں۔ آج کل قبروں کی کھدائی کے دوران سانپ بچھو کا نکل آنا عام سی بات ہو گئی ہے۔۔۔ کتنی قبروں کی کھدائی کرتے ہوئے عجیب سی وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔۔۔ چونکہ قبر کی کھدائی ننگے پاؤں کی جاتی ہے۔ کئی قبروں کی کھدائی میں میرے پیر جلنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں قبر کی تیاری کے دوران قبر سے دھواں بھی نکلتے دیکھا اور آگ کے شعلے بھی۔ کئی قبروں میں تدفین کے بعد قبروں پر رات کو آگ جلتی بھی دیکھی ہے اور کچھ قبروں سے چیخ و پکار بھی سن چکا ہوں۔ یہ باتیں بابا جی میرے مختلف سوالوں کے جواب میں مجھے بتا رہے تھے اور عالم تصور میں میں اپنی قبر کی فکر میں گم ہو گیا کہ نا جانے میری قبر سے روشنی نکل کر گورکن کا وجود روشن کرے گی یا گورکن کے پیر جلا ڈالے گی؟؟؟

اور پھر کیا خبر قبر بھی نصیب ہو کہ نہ ہو؟؟؟ یہ میری، آپکی فانی زندگی کی حقیقتیں ہیں جو میں آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں۔ قبر ہمارا وہ مستقل گھر ہے جس میں ہمارا صور کے پھونکے جانے تک رہنا مقدر ٹھہر چکا ہے۔ کبھی کبھی اپنے دلوں کو موہ لینے والے عارضی گھروں کو کچھ دیر کے لئے فراموش کر کے قبرستان میں جہاں میں اور آپ اپنی مستقل رہائش اختیار کرنے والے ہیں جا کر ان کے مکینوں کی رہائش گاہوں کو بھی دیکھ آیا کریں۔ تا کہ اپنی رہائش گاہ کے پلاٹ کا بھی اندازہ ہو اور اس میں اپنی رہائش کے لئے خیالوں اور تصور میں تانے بانے بھی بنتے رہا کریں۔۔۔ قبرستان دنیا کی واحد انٹرنیشنل ہاؤسنگ سوسائٹی ہے جس میں آپ کو دو گز کا پلاٹ بغیر ترقیاتی کاموں کے ملتا ہے۔ جہاں پر فرد کو اپنے پلاٹ میں روشنی، کشادگی، خوشگوار ہواؤں اور باغات کا انتظام پہلے سے خود کر کے آنا پڑتا ہے۔ لہٰذا کیا ہی اچھا ہو کہ جب میں اور آپ اپنے مستقل گھروں کو جائیں تو سارے انتظامات پہلے سے مکمل ہوں، اور کمی ہو تو صرف میری اور آپ کی آمد کی۔ اللہ ہم سب کی اس آنے والی منزل کو آسان بنائے۔ آمین۔ ***

رکشے والا: ایک سچّی کہانی

عارف نقوی، برلن

میں نے سفید قمیض اور پتلون پر ایک کالا مخملی کوٹ پہنا اور گھر سے باہر نکل کر رکشا کی تلاش کرنے لگا۔ لکھنؤ کے نشیبی علاقے علی گنج کی کالونی کا یہ سیکٹر ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ بہت سے نئے مکانات کھڑے ہو گئے تھے۔ دوکانیں اور ریستوراں ابھی نہیں تھے۔ میدانوں میں گھاس ابھی نہیں اُ گی تھی۔ جگہ جگہ پر اینٹوں اور ملبوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ درختوں اور پارکوں کے بارے میں شاید ابھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سڑکیں بھی زیادہ تر کچّی تھیں۔ اس لئے رکشے ٹانگے بہت کم ادھر آیا کرتے تھے۔ حالانکہ آج کل تو لکھنؤ میں انسانوں سے زیادہ رکشے ہی نظر آتے ہیں۔ بسیں اور اسکوٹر بھی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہی ملتے تھے۔ میں نے سفید قمیض اور پتلون پر ایک کالا مخملی کوٹ پہنا اور گھر سے باہر نکل کر رکشا کی تلاش کرنے لگا۔ لکھنؤ کے نشیبی علاقے علی گنج کی کالونی کا یہ سیکٹر ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ بہت سے نئے مکانات کھڑے ہو گئے تھے۔

دوکانیں اور ریستوراں ابھی نہیں تھے۔ میدانوں میں گھاس ابھی نہیں اُ گی تھی۔ جگہ جگہ پر اینٹوں اور ملبوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ درختوں اور پارکوں کے بارے میں شاید ابھی کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سڑکیں بھی زیادہ تر کچّی تھیں۔ اس لئے رکشے ٹانگے بہت کم ادھر آیا کرتے تھے۔ حالانکہ آج کل تو لکھنوئیں انسانوں سے زیادہ رکشے ہی نظر آتے ہیں۔ بسیں اور اسکوٹر بھی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہی ملتے تھے۔ میں برلن سے چھٹیوں پر اپنے آبائی شہر میں آیا ہوا تھا اور اپنی چچازاد بہن اور اس کی فیملی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ شہر کیمرکز تک جانے کے لئے رکشا کا ہی سہارا لینا پڑتا تھا اور کافی وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ حالانکہ صبیحہ جو ایک اسکول میں پڑھاتی ہے یہ کہکر تسلّی دیا کرتی تھی کہ ''بھائی جان، مجھے تو روز ہی رکشا سے کشمیری محلّے تک دس کلومیٹر تک جانا پڑتا ہے۔ اس کے چاروں چھوٹے چھوٹے بچے بھی رکشا ہی سے اسکول جاتے تھے اور صبیحہ کے شوہر تو رکشے کے ایسے عاشق تھے کہ ایک رکشا دن بھر ان کے دروازہ پر کھڑا رہتا تھا۔ علی گنج سے میں نے ایک رکشا لیا۔ رکشا والا کم عمر اور محنتی لگتا تھا۔ اس کا رکشا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور میں سنگترہ اور مونگ پھلیاں کھاتا ہوا تھوڑی دیر میں میڈیکل کالج، جسے لوگ شاہ مینا اسپتال بھی کہتے ہیں، پہونچ گیا۔ کئی میل کا سفر آناً فاناً کٹ گیا۔ وارڈ کے سامنے کچھ دور پر اسپتال کی دیوار سے شاہ مینا صاحب کا مزار لگا ہوتھا۔ کچھ عورتیں برقعہ اوڑھے اور آدھی نقاب اُٹھائے، ہاتھوں میں پھول لئے اس طرف جارہی تھیں۔

یہ ایک بہت بڑے بزرگ کا مزار ہے۔ کہتے ہیں بہت سی مرادیں وہاں پر پوری ہو جایا کرتی ہیں۔ ہر جمعرات کو فقیروں اور حاجتمندوں کی بھیڑ ہوتی ہے اور رات بھر قوالیاں ہوا کرتی ہیں۔ مجھے یاد آیا اسی اسپتال میں مرے والد کا انتقال ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی رہی ہوگی۔ ان کا کسرتی بدن، بغیر مانگ کے اُلٹے بال، چہرے پر چھوٹی سی مونچھ آج تک مجھے یاد ہے۔ وہ حیدرآباد میں ایک فزیکل کالج میں پرنسپل تھے اور عید کی چھٹیوں میں مجھے اور میری والدہ کو لے کر لکھنؤ آئے تھے اور میرے بڑے چچا کے ساتھ چکبست روڈ پر ٹھہرے تھے۔ عید کے دن انھوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے نئی شیروانی پہنائی تھی۔ سر پر پھنّے دار ترکی ٹوپی رکھی تھی اور عید کی نماز سے لوٹ کر مجھے اور میری والدہ کو لے کر میرے نانا کے گھر پنجابی ٹولے میں عید ملنے کے لئے گئے تھے اور کھانا کھانے کے بعد کوٹھے پر جا کر میرے ماموؤں کے ساتھ پتنگ اُڑانے لگے تھے۔ پھر کچھ دیر کے بعد نیچے اُتر کر بستر پر لیٹ گئے تھے۔ ان کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ شہر کے سب سے معروف طبیب ڈاکٹر حمید کے کہنے پر انھیں شاہ مینا اسپتال میں بھرتی کر دیا گیا، جہاں وہ ایک پرائیویٹ وارڈ میں ڈاکٹر حمید کے ہی زیر علاج رہے۔ میری والدہ اور ممانی ہسپتال میں روز ان کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ میں روز اپنی دادی کے ساتھ انکو دیکھنے جاتا اور وہ دیر تک میرے سر پر ہاتھ پھیرتے رہتے۔ مگر ایک دن دادی اماں سے بولے: ''آپ کل عارف کو نہ لائیے گا۔ تکلیف ہوتی ہے۔'' دوسرے دن جب دادی اماں ان کو دیکھنے گئیں تو ان کی نظریں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ اور پھر جوں ہی دادی اماں وہاں سے رُخصت ہوئیں میرے والد کو دل کا دورہ پڑا اور وہ بستر سے گر پڑے۔ نرسیں اور ڈاکٹر بھاگے ہوئے ان کے پاس پہنچے۔ میری والدہ شاہ مینا صاحب کے مزار کی طرف بھاگیں اور گڑ گڑانے لگیں مگر انھیں ہوش نہ آیا۔ میں نے بھی جب دوسرے دن ان کو گھر پر دیکھا تو وہ ایک چارپائی پر سفید چادر میں لپٹے ہوئے اطمینان سے سو رہے تھے۔ جسم سے کافور کی خوشبو آرہی تھی۔ تب سے جب بھی میں اس ہسپتال میں آتا ہوں یا ادھر سے گزرتا ہوں تو شاہ مینا صاحب کے مزار کے قریب پہنچ کر قدم رُک جاتے ہیں اور کمرہ نمبر ۱۸ یاد آجاتا ہے۔ ''صاحب چار روپئے نہیں

پانچ روپئے ہوئے ہیں۔علی گنج سے لایا ہوں۔کئی چڑھائیاں پڑی ہیں۔ڈالی گنج والی چڑھائی کم نہیں ہے۔جان نکال لیتی ہے۔'' رکشے والے نے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔ میں نے بحث نہ کی اسے پانچ روپئے دیدئے۔ حالانکہ اس نے خود کہا تھا:''صاحب جو سمجھ میں آئے دیدیجئے گا۔'' ہسپتال میں وارڈ نمبر آٹھ کے بیڈ نمبر بیالیس پر کوئی اور عورت لیٹی ہوئی تھی۔آس پاس کے کسی بیڈ پر بھی نکہت نہیں تھی۔نکہت میری خالہ زاد بہن ہے اور مجھے بتایا گیا تھا کہ اس کے گلے میں گلٹیاں پڑ گئی ہیں اور وہ آپریشن کے لئے شاہ مینا ہسپتال میں بھرتی کی گئی ہے۔

میں جلدی سے باہر نکل آیا۔دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی نرس سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ نکہت کو خارج کردیا گیا ہے۔ وہ گھر چلی گئی ہے۔کیوں؟ یہ نرس نے نہیں بتایا۔ بولی:''ڈاکٹر سے پوچھئے گا۔'' میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔سوچا نکہت کے گھر جا کر اسے دیکھ لوں۔وارڈ سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے کئی رکشے کھڑے نظر آئے۔ میں نے ایک رکشے والے سے پوچھا:''راجہ بازار چلنا ہے؟''''ضرور چلوں گا صاحب۔'' یہ ایک لمبا تڑنگا رکشے والا تھا۔گالوں میں کچھ گڑھے ضرور پڑے ہوئے تھے۔لنگی اور کرتہ پہنے۔کندھے پر ایک انگوچھا ڈالے۔اس کا رکشا بھی دوسرے رکشوں کے مقابلے میں کچھ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔سوچا جلدی پہنچا دے گا۔'' کتنے پیسے لوگے؟''''دیدیجئے گا بابو جی۔ جو آپ کی مرضی ہو۔'' بڑا چالاک ہے۔ میں نے سوچا۔ضرور زیادہ دینا پڑیں گے۔'' دو روپئے؟'' میں نے الفاظ پر زور دیا۔''ارے دیدیجئے گا، بابو جی۔ جو آپ کی سمجھ میں آئے۔اب ہم آپ سے بحث تھوڑے ہی کریں گے۔'' میں نے بحث نہ کی جھٹ اس کے رکشے پر بیٹھ گیا۔رکشا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔خنک ہوا تیزی سے میرے گریبان سے گزر کر سینے تک پہنچنے لگی۔ میں نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر کے گلا ڈھانپ لیا۔ دھوپ میں ابھی تیزی نہیں آئی تھی۔ رکشا ہسپتال کی باؤنڈری سے نکل کر سڑک پر دوڑ رہا تھا۔راجہ بازار کو لے جانے والی سڑک پر بہت سی بوسیدہ عمارتیں تھیں۔کئی نئی عمارتیں بھی بن رہی تھیں۔ایک طرف ایک لمبی سی دیوار پر طرح طرح کے کارٹون بنے ہوئے تھے۔ جیسے بہت سے اناڑی مصوروں نے سرِ عام اپنے فن کی نمائش کی ہو یا جیسے وہ روز یہاں آ کر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتے ہوں۔رکشا کی رفتار اچانک کم ہونے لگی۔رکشا والے کے ہانپنے کی آواز نے میری توجہ اپنی طرف کر لی۔اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ وہ بار بار جھاڑن سے اپنا منہ پونچھ رہا تھا۔کئی دوسرے رکشے تیزی سے آگے نکل گئے۔ مجھے کوفت ہونے لگی۔کہاں پھنس گیا ہوں۔ میں نے سوچا۔دھوپ کی تمازت بھی محسوس ہونے لگی۔ میں نے کوٹ کے بٹن کھول لئے۔''کمبخت بڑھتا ہی نہیں۔'' اچانک رکشے والے نے میری طرف گردن پھیری:''بابو جی، آپ ڈاکٹر ہیں؟'' زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے ڈاکٹر سمجھا تھا۔ہنسی آ گئی۔ مجھے تو انجکشن تک لگانا نہیں آتا۔انلجین اور جیلو سین سے زیادہ دواؤں بھی تمیز نہیں۔بچپن میں جب کوئی باز میرے کبوتر کو پکڑ لیتا تھا اور میں غلیل کی مدد سے اسے چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو اس وقت اس کے پھٹے ہوئے پوٹے کو سوئی سے سینے اور اس پر کبوتر کی بیٹ لگا کر ٹھیک کرنے میں ضرور کامیاب ہو جایا کرتا تھا۔حالانکہ اس وقت مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ سوئی کو پہلے جلا کر اس کا زہر مار دینا چاہئے۔''نہیں بھائی مجھے ڈاکٹری واکٹری نہیں آتی۔'' رکشے والے نے پھر کچھ نہ پوچھا۔ رکشا سے جدوجہد کرتا رہا۔''آخر تمھیں یہ خیال کیسے آیا، کہ میں ڈاکٹر ہوں؟'' میں نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔''بابو جی آپ کالا کوٹ پہنے ہیں اور سفید پتلو...سمجھا شاید آپ کوئی وکیل یا ڈاکٹر بابو ہوں گے۔شاید میری مدد کر سکیں۔ شاید آپ کسی ڈاکٹر بابو کو جانتے ہوں۔ بابو جی...''''کیا تمھارا کوئی رشتے دار ہسپتال میں بھرتی ہے؟''''نہیں بابو جی...اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ میں خود بیمار ہوں۔آپ کا کوئی جاننے والا ہو تو مدد کر سکتا ہے۔ٹھیک سے علاج ہو جائے گا۔''''کیا بیمار ہو؟'' مجھے اب اس میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔''بابو جی، ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ میرے پیٹ میں پھوڑا ہے۔'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔''پھوڑا؟''''ہاں بابو جی، پیٹ میں۔ وہ ایک ڈاکٹر بابو ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ اسپتال میں دکھاؤ۔

شاید آپریشن کرنا ہوگا۔'' پیٹ میں پھوڑا...اور رکشا گھسیٹ رہا ہے اور میں اس پر بیٹھا ہوں۔ایسا لگا جیسے شرم سے گڑ جاؤں گا۔نہیں بلکہ ایسا لگا، جیسے اب وہ رکشے والا اپنی لنگی اور کرتا پہنے، جھاڑن سے پسینہ پونچھ کر میرے اوپر سوار ہو گیا ہے اور میں اس کا رکشا گھسیٹ رہا ہوں اور میرے ماتھے سے پسینے کے جھرنے پھوٹ رہے ہیں۔ رکشے والا کہہ رہا تھا:''بابو جی میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں کہ علاج کروا سکوں۔اسپتال میں بھرتی ہونے کے لئے رُسوخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ہاں بابو جی سرکاری ہسپتال ہے۔مفت دواخانہ ہے، مگر رُسوخ اور پیسے نہیں ہیں۔ میں تو صرف ایک رکشے والا ہوں۔'' اس نے بتایا کہ دن بھر رکشا چلانے کے بعد شام کو مالک کو رکشا کا کرایہ دینا ہوتا ہے۔ روٹی کھانی ہوتی ہے۔

اس کی بیوی اور تین بچّے گاؤں پر ہیں۔ انھیں پیسے بھیجنے ہوتے ہیں۔ ''ہومیو پیتھک علاج کراؤ۔ بہت سستا ہوتا ہے۔ حکیمی علاج کراؤ۔ کسی ویدکو دکھاؤ۔'' میں اسے یہ سب مشورے دے سکا، مگر ہسپتال میں بھرتی نہ کرا سکا۔ کچھ دور چل کر میں نے اسے دس روپئے کا ایک نوٹ دیا اور رکشا سے اُتر گیا۔ بغیر اسے یہ بتائے کہ کیوں اُتر رہا ہوں۔ ''بابو جی۔ ٹوٹے پیسے دیجئے!'' اور پھر وہ مجھے حیرت سے دیکھتا رہا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ مجھے آج تک یہ سوچ کر شرم آتی ہے کہ میں اسکی مدد نہ کر سکا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کہیں میرے رکشا سے اتر جانے سے اُس کا دل نہ ٹوٹ گیا ہو۔ نہ جانے اب وہ کس حال میں ہوگا۔ اس کا چہرہ شاید اب اور زیادہ پچک گیا ہوگا۔ پھوڑا شاید پھٹ چکا ہوگا یا پھٹنے والا ہوگا۔ اس کا رکشا اب کوئی اور چلا رہا ہوگا... اور اس کے بیوی بچّے...؟ اور میں اس وقت برلن کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور اسے یاد کر رہا ہوں۔ اپنے ملک کی ایک حقیقت کو... رکشے والا... جو اکیلا نہیں، میرے ہم وطنوں میں سے ایک ہے۔

***

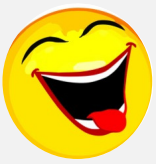

امجد مرزا کے ساتھ چند قہقہے

موسم کے لحاظ سے:: موسلا دار بارش ہورہی تھی۔ کرایہ دار نے مالک مکان سے کہا۔ ''جناب آپ کے مکان کی چھت اس قدر ٹپک رہی ہے کہ میری ساری مرغیاں بری طرح بھیگ رہی ہیں۔'' مالک مکان نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''تو بھائی! آپ موسم کا لحاظ کرتے ہوئے کچھ مدت کے لئے مرغیوں کی بجائے بطخیں کیوں نہیں پال لیتے۔''

ایک زبان:: پچاس سال کے بعد اس نے اپنے دوست پٹھان سے پوچھا۔ ''یار تمہاری عمر کیا ہوگی؟'' پٹھان نے جواب دیا۔ ''بیس سال۔'' وہ حیران ہوکر بولا۔ ''یار تم نے پچاس برس پہلے بھی یہی عمر بتائی تھی اور آج بھی تم بیس سال کے ہی ہو۔؟'' پٹھان دوست نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ''اوئے پٹھان کا ایک زبان ہوتا ہے۔''

اجازت:: ایک لڑکے نے اپنے باپ سے پوچھا۔ ''ابا جان! میں اتنا بڑا کب ہوں گا کہ امی سے اجازت لئے بغیر باہر جا سکوں۔؟'' باپ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''بیٹے اتنا بڑا تو ابھی میں بھی نہیں ہوا''۔

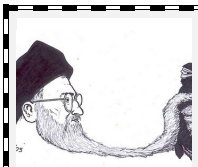

ملاں کی داڑھی میں تنکا
نام نہاد علماء کے نام ایک اہم خط

علمائے دین متین !السلام علیکم

علمائے کرام! پہلی درخواست تو یہ کروں گا کہ یہ المناک تحریر آخر تک ضرور پڑھیئے گا۔

سب سے پہلے ذرا خانیوال کی ایک خبر پڑھ لیں جو واٹس ایپ پر میں نے پڑھی اور جسے پڑھنے کے بعد مجھے آپ کی خدمت میں خط لکھنے کی جسارت پیدا ہوئی، شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات اور اگر تیرے دل میں میری بات نہ اُترے تو عین ممکن ہے کہ میں ہی آپ لوگوں کے دل میں اُتر جاؤں، ''چور کا متاثرین کے نام خط'' خانیوال (ڈیلی پاکستان آن لائن) پاکستان کے شہر خانیوال کے نواحی علاقے جہانیاں میں چور مسجد سے یو پی ایس کی بیٹریاں اور چندے کا ڈبہ چوری کر کے فرار ہوگیا اور پیچھے ایک خط بھی چھوڑ گیا جس میں اس نے چوری کی ایسی وجہ بیان کردی کہ پڑھ کر ہر کوئی دنگ رہ گیا۔ تفصیلات کے مطابق جامع مسجد صدیق المدینہ کے امام قاری سعید نے کہا ہے کہ جب تمام نمازی لیلۃ القدر کی رات عبادت میں مصروف تھے تو اس وقت چور مسجد سے یو پی ایس کی بیٹریاں اور گلہ اُٹھا کر لے گیا جس میں ممکنہ طور پر 50 ہزار سے زائد رقم موجود تھی جبکہ چور نے جاتے ہوئے ایک خط بھی چھوڑا ہے جس مین اس نے کہا ہے کہ یہ معاملہ میرے اور خدا کے درمیان ہے اس لئے کوئی بھی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس لئے اللہ کے گھر سے چوری کی۔ خط میں چور نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک بار وہ اس مسجد میں آیا تھا اور اس نے امام صاحب کو مدد کے لئے کہا تھا لیکن بعد میں امام صاحب نے مدد سے انکار کرتے ہوئے مسجد سے باہر نکال دیا تھا۔ جب لوگوں نے میری مدد کرنے سے انکار کردی تو میں مسجد سے چوری کرنے پر مجبور ہوگیا۔ میں نے کسی کے گھر سے کچھ نہیں چرایا ہے، میں یہاں سے کچھ ہی چیزیں لے جا رہا ہوں تاہم اس لئے یہ میرے اور اللہ کے درمیان معاملہ ہے اور کسی کو اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے .....اس خط سے لگتا ہے کہ وہ بڑی معرفت والا چور ہے، بے چارے نے اپنی دانست میں ٹھیک ہی کیا ہوگا، مجھے اس پر ایک اور بڑے پہنچے ہوئے چور کا شعر یاد آ گیا کہ۔

یہ جو چپل میں پہن کر آیا ہوں
مت سمجھو کہ چُرا کر لایا ہوں

یہ سب خدا کی دین ہے
اسی کے گھر سے اُٹھا کر لایا ہوں

پھر ایک اور چور صاحب اپنے کلام میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ۔

رات کا وقت ہے اور ہے مسجد بھی قریب
جلد اُٹھئے کہ پیغامِ عمل لایا ہوں
آپ کے گھر میں جتنے بھی ہیں پرانے جوتے
جاکے بدل لیجئے میں بھی بدل لایا ہوں

قابلِ احترم علمائے کرام!

ایک اور واقعہ مجھے یاد آ گیا جسے پڑھنے کے بعد بھی آپ میرے مضمون کو پڑھنا جاری رکھ سکتے ہیں کیوں کہ میرے مضمون میں آپ کو قدم قدم پر نصیحت آمیز باتیں مل سکتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایک امام مسجد جو اپنی کئی جوتیاں مسجد سے چوری کروا کروا کر تنگ آ چکے تھے، انہوں نے اس حادثے سے بچنے کے لئے عید والے دن ایسا کیا کہ اپنے نئے جوتے شاپر میں ڈال کر اپنے پاس محراب میں سجدے کے سامنے رکھ لئے اور نماز عید کی نیت نا بدھ لی۔ مولوی صاحب نیت باندھنا تھا کہ ایک صاحب نہایت کمال چابک دستی سے مولوی صاحب کے جوتے اُٹھا کر چل پڑے۔ مولوی صاحب جن کی توجہ نماز میں کم اور اپنے جوتوں کی طرف زیادہ تھی انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ نیت توڑی اور ان حضرت کو اسی کمال چابک دستی سے دبوچ لیا اور دو ایک ہاتھ جڑ دیئے۔ مولوی صاحب کا ایسا کرنا تھا کہ سب لوگوں نے نماز توڑ دی کہ پتہ نہیں کیا واقعہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہاں پر موجود جم غفیر اس بے چارے جوتی چور پر ٹوٹ پڑا۔ محلے کے دو چار معزز ین حضرات نے بھی اس کار خیر میں حصہ لیا۔ کچھ صحت مند قسم کے نوجوانوں کو طاقت آزمائی کا بہترین موقع ہاتھ آ گیا۔ یوں اگر وہ کسی سے مقابلہ کرتے تو دوسری طرف سے جوابی کاروائی ک امکان رہتا۔ یہاں ایسا کوئی خطرہ نہ تھا کیوں کہ مقابلہ یک طرفہ تھا۔ مولوی صاحب اس جوتی چور سے بولے: ''تمہیں میرے ہی جوتے ملے تھے اُٹھانے کو؟'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا: ''مولوی صاحب! آپ تو ناحق ناراض ہو رہے ہیں... ابھی پچھلے مہینے ہی تو آپ کی شادی کے موقع پر جب آپ کی سالیوں نے جوتا چرایا تھا تو آپ نے پورے دو ہزار روپے دے کر خوشی خوشی اُسے چھڑایا تھا۔ میں نے سوچا کہ دو ہزار نہ سہی دو سو تو مجھے بھی مل ہی جائیں گے لیکن آپ نے بجائے پیسے دینے کے مجھ غریب پر مُکوں اور لاتوں کی برسات کر دی''

چور کی یہ بات سن کر مولوی صاحب لاجواب ہو گئے اور سوچنے لگے اس میں اس بدنصیب کا کیا قصور ہے۔ ہم لوگ ہی تو شادی میں جوتی چوری کی رسم کے ذریعہ اور مسجدوں میں جوتوں کی رکھوالی کا انتظام نہ کر کے جوتی چوری کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات اور اشعار کا تعلق اگرچہ چوروں سے ہے لیکن مولانا کرام آپ بھی کسی چور اور ڈکیت سے کم نہیں، پہلے ایک واقعہ آپ لوگ اپنی شان میں بھی ملاحظہ فرمالیں پھر میرے مضمون کو آگے جاری رکھیئے گا، ایک مولوی صاحب کھیتوں سے گزرے، کیا دیکھا کہ ایک بیل کنویں کے گرد گھومے جا رہا ہے اور پانی نکل رہا ہے۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ آس پاس بھی کوئی نہیں اور بیل اپنا کام بھی کر رہا ہے، جب ادھر ادھر دیکھا تو کچھ دُور ایک پگڈنڈی پر بیٹھ کر حقہ پی رہا تھا، مولوی صاحب نے جا کر پوچھا، اے شخص یہ بیل کیا تمہارا ہے جو خود ہی گھوم گھوم کر کنویں سے پانی نکال رہا ہے، رکتا ہی نہیں حالانکہ تم یہاں دور بیٹھے ہو۔ وہ شخص کہتا ہے نہیں نہیں مولانا صاحب اس کے گلے میں گھنٹی ہے، وہ جب تک گھومتا رہے گا گھنٹی کی آواز آتی رہے گی اور مجھے پتہ چلتا رہے گا کہ بیل پانی نکال رہا ہے، مولوی صاحب کہتے ہیں، یہ کیا بات ہوئی اگر بیل ایک جگہ کھڑا ہو کر سر ہلاتا رہے تو بھی تو گھنٹی کی آواز آئے گی، اس شخص نے کہا مولوی صاحب، وہ بیل ہے کام چور مولوی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولویوں کی اکثریت کام چور ہی ہے، اور اس لحاظ سے دیگر چوروں اور مولویوں میں کوئی فرق نہیں اور ہم بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ ☆ مولوی کی داڑھی میں تنکا ☆ اصل محاورہ اگرچہ یہ ہے کہ ☆ چور کی داڑھی میں تنکا ☆ لیکن چونکہ اکثر چوروں کی داڑھی نہیں ہوتی جب کہ مولویوں کی ہوتی ہے اس لئے یہ محاورہ مولویوں پر ہی صادق آتا ہے، آجکل کے مولوی نہ صرف چور ہیں بلکہ ڈکیت اور دھشتگر د بھی ہیں، نیز دوسروں پر واجب القتل کے فتوے لگا کر قاتل بھی بنتے ہیں بلکہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ کے مصداق ہیں، اور آپ لوگوں کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، اس لئے مجھے مزید کہنے کی فی الحال ضرورت نہیں، آپ لوگوں کے بارے میں خدا کے برگزیدہ فرماتے ہیں کہ ☆ مولوی لوگ اپنے نفسانی جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں، دعوت اسلام کی نہ لیاقت رکھتے ہیں۔ نہ اس کا کچھ جوش، نہ اس کی کچھ پرواہ، اگر ان سے کچھ ہو سکتا ہے تو صرف اسقدر کہ اپنی ہی قوم اور اپنے ہی بھائیوں اور اپنے جیسے مسلمانوں اور اپنے جیسے کلمہ گوؤں اور اہلِ قبلہ کو کافر قرار دیں۔

والسلام آپ کا خیر خواہ منطق الطیر۔

***

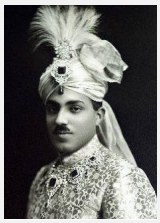

''نواب سر صادق محمد خان عباسی''

ادارہ

نواب سر صادق محمد خان عباسی ریاست بہاولپور کے آخری حکمران تھے۔آپ 1904 September میں پیدا ہوئے اور 1967 My وفات پائی ۔آپ تین سال کی عمر میں ریاست بہاولپور کے نواب بنے اور آپ نے 1955 تک بہاولپور پر حکمرانی کی ۔نواب صادق نے تحریک پاکستان کے دوران کراچی میں موجود اپنے الشّمس محل اور القصر محل قائداعظم محمد علی جناح اور فاطمہ جناح کو دے دیئے تھے جن آج سندھ کا گورنر بیٹھتا ہے ۔جس نے پاکستان بننے کے بعد پاکستانی کرنسی کی اُس وقت گارنٹی دی تھی جب کوئی ملک گارنٹی ہی نہیں دے رہا تھا اور پہلی تنخواہ چلانے کے لئے خطیر رقم بھی دی تھی۔آپ کی دی ہوئی شاہی سواری پر بیٹھ کر قائداعظم محمد علی جناح بطور گورنر جنرل حلف اُٹھانے گئے۔آپ نے پاکستان کے سربراہ قائداعظم کو ان کے شایانِ شان مہنگی ترین رولز رائس گاڑی ان کو تحفے میں دے دی جب کہ ان کی رہائش کے لئے ذاتی محل بھی پیش کر دیا۔جب ایران کے صدر پہلی بار پاکستان کے دورے پر آئے تو پاکستانی حکومت کے پاس اچھے برتن بھی نہ تھے، جسے وہ ایرانی صدر کے سامنے پیش کر سکتے ۔اس موقع پر بھی نواب صادق نے شاہی برتنوں سے بھر کر ایک ٹرین کراچی روانہ کی ۔جن میں زیادہ تر برتن چاندی اور سونے کے بھی تھے۔آپ نے یہ برتن بھی بعد میں واپس نہیں لئے ۔جس کی خدمات دیکھ کر قائداعظم نے آپ کو ''محسن پاکستان'' کا خطاب دیا تھا اور کہا تھا کہ'' پاکستان بننے سے بھی پہلے پاکستان موجود تھا اور وہ ریاست بہاولپور۔'' جی ہاں وہ ریاست جہاں ستلج ویلی پراجیکٹ اور برصغیر کے سب سے بہترین نہری نظام کی وجہ سے ''باغات کی سرزمین'' کہا جاتا ہے ۔یہ برصغیر کی واحد ریاست تھی جس کی سرکاری زبان اردو اور مذہب اسلام تھا۔ وہ ریاست جس میں صادق ایجرٹن کالج ، صادق ڈین ہائی سکول اور جامعہ اسلامیہ جیسے ادارے مفت تعلیم کے فروغ میں کوشاں رہے ، جہاں سے منیر نیازی ،احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمان جیسی نامور شخصیات نے صلاحیتیں پروان چڑھیں ۔وہ ریاست جہاں بہاول وکٹوریہ ہسپتال اور سول ہسپتال احمد پور شرقیہ جیسے مراکز میں جدید طبی سہولیات مفت فراہم کی جاتی تھیں اور مریضوں کے لئے وظیفہ مقرر ہوتا تھا۔تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ پنڈت نہرو لندن میں ریاست بہاول پور کے امیر نواب صادق خاں عباسی کو ہندوستان میں شمولیت پر اکساتے ہوئے اقتدار اور مراعات کی ترغیب دے رہا ہے ۔مؤرخ سانس روکے نواب آف بہاولپور کے فیصلے کا منتظر ہے ۔ایک طرف ذاتی مفاد ہے اور دوسری طرف عوام کی خواہش ۔نواب صاحب ذاتی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر مذہبی رشتے اور عوامی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کرتے ہیں ۔مؤرخ نے ان کی عظمت کو سلام پیش کیا اور تاریخ کے اوراق پر ان لمحات کو محفوظ کر لیا۔آپ نے 05 اکتوبر 1947 کو ریاست بہاولپور کا الحاق پاکستان کے ساتھ کیا۔اس طرح بہاول پور پہلی ریاست تھی جس نے سب سے پہلے پاکستان کے ساتھ الحاق کیا۔نواب صاحب نے تحریک پاکستان کے لئے 52 ہزار پاؤنڈ کی امداد دینے کے بعد نوزائیدہ ملک کو مالی طور پر مستحکم کرنے اور سرکاری ملازمین کو تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے مزید 10 کروڑ روپے حکومت پاکستان کو دیئے جو موجودہ تقریباً چار پانچ ارب سے زائد روپے بنتے ہیں ۔آپ نے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کو رہنے کے لئے جگہ دی اور بہترین سہولیات فراہم کیں، جب 1935 میں کوئٹہ میں شدید زلزلہ آیا تو آپ نے متاثرین کی ہر طرح سے امداد کی ۔سرکاری ریکارڈ کے مطابق آپ نے پنجاب یونیورسٹی ، ایچی سن کالج اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کو بیش بہا عطیات دیئے جو کبھی زمین کے تحفہ کی صورت میں اور کبھی عمارتیں بنانے کے لئے سرمایہ کی فراہمی کی صورت میں تھے ۔آپ نے 1942 میں بہاول پور میں ایک چڑیا گھر بنوایا ۔ڈرنگ سٹیڈیم بنوایا ۔ 1954 میں پاکستان او بھارت کا پہلا میچ بھی ڈرنگ سٹیڈیم میں ہوا تھا۔ یہ فہرست بہت طویل ہے ۔مگر افسوس کہ آج ملک عزیز کی تاریخ میں نواب سر صادق محمد خاں عباسی کا نام ونشان تک نہیں ۔نہ ہی نصاب کی کسی کتاب میں ان کی خدمات کا ذکر ہے ۔ جسے ہندوستان کی امیر ترین ریاست کا نواب ہونے کا اعزاز حاصل تھا، وہ جسنے نوزائیدہ پاکستان کو پہلا آکسیجن ماسک فراہم کیا۔

ایک دلچسپ اور نکتہ خیز تحریر

ادارہ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق برصغیر کا عظیم دماغ تھے۔ یہ 1901 میں اٹک میں پیدا ہوئے۔ والد گاؤں کے امام تھے، ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسوں میں حاصل کی، مولوی فاضل ہوئے، منشی فاضل ہوئے اور ادیب فاضل ہوئے میٹرک کیا اور میٹرک کے بعد اسلامی اور مغربی دونوں تعلیمات حاصل کیں۔ عربی میں گولڈ میڈل لیا' فارسی میں ایم اے کیا اور 1940 میں پی ایچ ڈی کی' امام ابن تیمہ پر انگریزی زبان میں تھیسس لکھا۔ امامت سے عملی زندگی شروع کی' پھر کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ آپ نے تھیسس کو آکسفورڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی نے قبولیت بخشی' اسلام پر ریسرچ شروع کی' 1949ء میں پاکستان کی تشکیل سے دو سال بعد ''دو اسلام'' کے نام سے معرکۃ الآراء کتاب لکھی اور پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ کتاب، کتاب نہیں تھی ایک عالمی انقلاب تھا۔ ''دو اسلام'' کے بعد ''قرآن'' اور ''من کی دنیا'' لکھی اور اسلامی دنیا کے پیاسے ذہنوں کو سیراب کر دیا۔ میں جب بھی ''دو اسلام'' اور ''دو قرآن'' پڑھتا ہوں اور آج کے پاکستان کی عدم برداشت، مذہبی تشدد اور مکالمے کا قبرستان دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں ماضی کا پاکستان دانش، برداشت، علم اور مکالمے میں آج کے پاکستان سے کتنا آگے تھا تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور ان کا پاکستان کسی قدر بالغ تھا آپ یہ جاننے کے لئے ''دو اسلام'' کا صرف ابتدائیہ ملاحظہ کیجئے۔ میں اس ابتدائیہ کو چند جگہوں سے ایڈٹ کر رہا ہوں کیوں کہ آج کا مسلمان ڈاکٹر برق کے مسلمانوں سے بہت پیچھے ہے، ڈاکٹر صاحب جیسے دانشور اور مسلم اسکالرز کی باتیں صرف ماضی میں ہی لکھی اور بیان کی جا سکتی تھیں، ہم لوگ آج ان کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ کیونکہ آج کے مسلمان میں سب کچھ ہے اگر نہیں ہے تو اسلام نہیں''... یہ 1981ء کا ذکر ہے میں والد صاحب کے ساتھ امرتسر گیا۔ میں چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا، جہاں نہ بلند عمارات نہ مصفا سڑکیں نہ کاریں نہ بجلی کے قمقمے اور نہ اس وضع کی دکانیں، دیکھ کر دنگ رہ گیا، لاکھوں کے سامان سے سجی دکانیں اور بورڈ پر... کہیں رام بھیجا سنت رام لکھا تھا، کہیں دُنی چند اگروال، کہیں سنت سنگھ سیال اور کہیں شادی لال فقیر چند پال بازار کے اس سرے سے اس سرے تک کسی مسلمان کی کوئی دکان نظر نہیں آئی ہاں مسلمان ضرور نظر آئے کوئی بوجھ اُٹھا رہا تھا۔ کوئی گدھے لاد رہا تھا، کوئی کسی ٹال پر لکڑیاں چیر رہا تھا، اور کوئی بھیک مانگ رہا تھا، غیر مسلم کاروں اور فٹنوں پر جا رہے تھے اور مسلمان اڑھائی من بوجھ کے نیچے دبا ہوا مشکل سے قدم اُٹھا رہا تھا۔ ہندوؤں کے چہرے رونق، بشاشت اور چمک تھی اور مسلمان کا چہرہ فاقہ، مشقت، فکر اور جھریوں کی وجہ سے افسردہ و مسخ۔ میں نے والد صاحب سے پوچھا کیا مسلمان ہر جگہ اسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں؟

والد صاحب ہاں میں نے عرض کیا، اللہ نے مسلمان کو بھی ہندو کی طرح دو ہاتھ دو پاؤں اور ایک سر عطا کیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے ہندو تو زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے اور مسلمان ہر جگہ حیوان سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔

والد صاحب: یہ دنیا مردار سے زیادہ نجس ہے اور اس کے متلاشی کتوں سے زیادہ ناپاک ہیں۔ اللہ نے یہ مردار ہندوؤں کے حوالے کر دیا ہے اور جنت ہمیں دے دی ہے، کہو کون فائدے میں رہا؟ ہم یا وہ؟ میں بولا: ''اگر دنیا واقعی مردار ہے تو پھر آپ تجارت کیوں کرتے ہیں اور مال تجارت خریدنے کے لئے امرتسر تک کیوں آئے؟ ایک طرف دنیاوی ساز و سامان خرید کر منافع کمانا اور دوسری طرف اسے مردار قرار دینا، عجیب قسم کی منطق ہے۔'' والد صاحب: بیٹا بزرگوں سے بحث کرنا سعادت مندی نہیں، جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے وہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے۔ حدیث کا نام سن کر میں ڈر گیا اور بحث بند کر دی، سفر سے واپس آ کر میں نے گاؤں کے ملاں سے اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ میرے دل میں اس معمے کو حل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی لیکن میرے قلب ونظر پہ تقلید کے پہرے تھے، علم کم تھا ورفہم محدود اس لئے معاملہ اُلجھتا گیا۔ میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کے لئے مختلف علماء وصوفیاء کے ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی، سینکڑوں واعظین کے واعظ سنے، بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام رائج کا ماحاصل یہ ہے۔ توحید کا اقرار اور صلوٰہ، زکوٰۃ، صوم اور حج کی بجا آوری اذان کے بعد ادب سے کلمہ شریف پڑھنا، جمعرات، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا۔ قرآن کی عبارت کو پڑھنا، اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا

عمل سمجھنا، قرآن اور درود کے ختم کرانا، حق ہو کے ورد کرنا، مرشد کی بیعت کرنا، مرادیں مانگنا، مزاروں پر سجدے کرنا، سڑکوں اور بازاروں میں سب کے سامنے آزار بند کو ڈھیلا کرنا، تعویذوں کو مشکل کشا سمجھنا کسی بیماری یا مصیبت سے نجات کیلئے مولوی جی کی دعوت کرنا، گناہ بخشوانے کے لئے قوالی سننا، غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا، طبیعات، ریاضیات، اقتصادیات، تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا، غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا، صرف کلمہ طیبہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا اور ہر مشکل کا علاج عمل اور محنت کی بجائے دعاؤں سے کرنا، میں علمائے کرام کے فیض سے جب تعلیمات اسلامی پر پوری طرح حاوی ہو گیا تو یہ حقیقت واضح ہوئی۔ خدا ہمارا، رسول ہمارا' فرشتے ہمارے' جنت ہماری، حوریں ہماری ، زمین ہماری، آسمان ہمارا۔ الغرض سب کچھ کے مالک ہم ہیں اور باقی قومیں اس دنیا میں جھک مارنے آئی ہیں۔ ان کی دولت: عیش محض چند روزہ ہے۔

وہ بہت جلد جہنم کے پست ترین طبقے میں اوندھے پھینک دیئے جائیں گے۔ اور یہ کمخواب و زربفت کے سوٹ پہن کر سرمدی بہاروں میں حوروں کے ساتھ مزے لوٹیں گے۔ زمانہ گزرتا گیا، انگریزی پڑھنے کے بعد علوم جدیدہ کا مطالعہ کیا، قلب و نظر میں وُسعت پیدا ہوئی، اقوام و ملل کی تاریخ پڑھی تو معلوم ہوا۔ مسلمانوں کی 128 سلطنتیں مٹ چکی ہیں۔ حیرت ہوئی کہ جب اللہ ہمارا اور صرف ہمارا تھا تو اس نے خلافت عباسیہ کا وارث ہلاکو جیسے کافر کو کیوں بنایا؟ ہسپانیہ کے اسلامی تخت پہ فرونیاں کو کیوں بٹھایا؟ مغلیہ کا تاج الزبتھ کے سر پر کیوں رکھ دیا؟ بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ، سربیا، پولینڈ، کریمیا، یوکرائین، یونان اور بلغراد سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیئے؟ ہمیں فرانس سے بیل بینی دو گوش کیوں نکالا؟ اور تیونس، مراکو، الجزائر اور لیبیا سے ہمیں کیوں رُخصت کیا؟ میں رفع حیرت کے لئے مختلف علماء کے پاس گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ میں اس مسئلے پر پانچ سات برس تک غور و فکر کیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا، میں ایک دن سحر کو بیدار ہوا، طاق میں قرآن شریف رکھا تھا، میں اُٹھایا، کھولا اور پہلی آیت جو سامنے آئی وہ یہ تھی۔

(ترجمہ) کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے ہم ان سے پہلے کتنی اقوام کو تباہ کر چکے ہیں، ہم نے انہیں وہ شان و شوکت عطا کی تھی جو تمہیں نصیب نہیں ہوئی۔ ہم ان کے کھیتوں پر چھما چھم بارشیں برساتے تھے اور ان کے باغات میں شفاف پانی کی نہریں بہتی تھیں لیکن انہوں نے ہماری راہیں چھوڑ دیں تو ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور ان کا وارث کسی اور قوم کو بنا دیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں، اندھی تقلید کی وہ تاریک گھٹائیں جو دماغی ماحول پر محیط تھیں یک بیک چھٹنے لگیں اور اللہ کی سنت جاریہ کے تمام گوشے بے حجاب ہونے لگے۔ ''میں نے قرآن میں جا بجا یہ لکھا دیکھا... یہ دنیا دارالعمل ہے یہاں صرف عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں، ہر عمل کی جزا و سزا ہے جسے نہ کوئی دعا ٹال سکتی ہے اور نہ دوا''۔ ''لیس للانسانِ الاماسعیٰ'۔ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (القرآن) میں سارا قرآن مجید پڑھ گیا اور کہیں بھی محض... دعا یا تعویذ کا کوئی صلہ نہ دیکھا۔ کہیں بھی زبانی خوشامد کا اجر زمردیں محلات، حوروں اور حجوں کی شکل میں نہ پایا۔ یہاں میرے کانوں نے صرف تلوار کی جھنکار سنی اور میری آنکھوں نے غازیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے شعلوں میں کود رہے تھے۔ وہ دیوانے دیکھے جو عزم و ہمت کا علم ہاتھ میں لئے معانی حیات کی طرف باانداز طوفان بڑھ رہے تھے اور وہ پروانے دیکھے جو کسی کے جمال جاں افروز پہ رہ رہ کے قربان ہو رہے تھے۔ قرآن مجید کے مطالعے کے بعد مجھے یقین ہو گیا مسلمان ہر جگہ محض اس لئے ذلیل ہو رہا ہے کہ اس نے قرآن کے عمل، محنت اور ہیبت والے اسلام کو ترک کر رکھا ہے۔ وہ وعید کے نشے میں مست ہے اور اس کی زندگی کا تمام سرمایہ چند دعائیں اور چند تعویذ اور بس اور ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ اسلام دو ہیں۔ ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا وہ اسلام جس کی تبلیغ ہمارے اسی لاکھ مُلا قلم اور پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر کر رہے ہیں۔

(غلام جیلانی برق کیمبل پور 25 ستمبر 1949ء)

پاک فوج کا ماٹو اور سراج الحق صاحب کی منطق

طارق احمد مرزا

امیر جماعت اسلامی سراج الحق صاحب نے (جو حالیہ الیکشن ہار چکے ہیں) چند ماہ قبل نیوز ون چینل کی اینکر پرسن نادیہ مرزا کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ جب تک پاک فوج کا ماٹو ''ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ'' مقرر ہے اور مقرر رہے گا، تب تک کسی غیر مسلم، بالخصوص احمدیوں کو پاک فوج میں ملازمت نہیں دی جاسکتی۔ آپ سے یہ انٹرویو کیپٹن (ر) محمد صفدر صاحب (جو آج کل جیل میں ہیں)، کی سابقہ قومی اسمبلی میں کی گئی احمدیہ مخالف تقریر کے تناظر میں لیا گیا تھا۔ جناب سراج الحق صاحب نے اپنے نقطہ نظر کی جو منطقی تشریح پیش فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص غیر مسلم ہے تو اس کا ''ایمان'' کہاں سے آئے گا؟ اور جب ایمان ہی نہیں تو ''تقویٰ'' کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جب ایمان ہو نہ تقویٰ تو ایسے شخص سے ملک کے دفاع میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' بجا لانے کی اُمید باندھنا یا توقع رکھنا کیسے ممکن ہے؟۔ ایمان سے خالی، تقویٰ سے عاری شخص پر اعتبار کیا ہی نہیں جاسکتا۔ تو جب پاکستان آرمی کا ماٹو ہی یہی ہے تو پھر کسی غیر مسلم کو پاکستانی فوج میں ملازمت کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے۔

محترم سراج الحق صاحب کی بات منطقی اعتبار سے ہے تو درست۔ ایک ''بے ایمان'' فوجی پر بھلا کون اعتبار کرے گا؟۔ اس کے باوجود اگر پاک فوج جنرل ضیاء الحق کے عطا کردہ اس ماٹو ''ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ'' کو اپنائے بیٹھی ہے تو پھر اسے اپنے قول و فعل کے اس تضاد کو ضرور دور کرنا چاہئے یا کم از کم قوم کے سامنے وضاحت پیش کرنا چاہئے کہ وہ کیوں پاکستان کے ان ''بے ایمان'' افراد کو فوج میں بھرتی بھی کرتی ہے اور کلیدی عہدوں تک پہنچنے سے بھی نہیں روکتی۔ ان میں احمدی بھی شامل ہیں، ہندو بھی، سکھ بھی اور مسیحی بھی۔ پاک فوج میں شامل یہ سب آئینی اور غیر آئینی غیر مسلم (یا غیر مسلم قرار دیئے گئے) پاکستانی سراج الحق صاحب کی منطق کے مطابق ''بے ایمان'' فوجی ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ سراج الحق صاحب نے انٹرویو میں لفظ ''بے ایمان'' ہرگز استعمال نہیں کیا، بالکل درست لیکن موصوف نے پاکستان آرمی کے ان غیر مسلم فوجیوں کو صاحبِ ایمان، مومن اور متقی تو بھی قرار نہیں دیا۔ واضح رہے کہ اس تحریر میں جہاں جہاں کسی کے لئے ''بے ایمان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ سراج الحق صاحب کی منطق کی رُو سے ہے، راقم کا ہرگز کسی کے ایمان سے کوئی لینا دینا نہیں۔ قارئین کرام سراج الحق صاحب کا انٹرویو سنتے ہی پہلا ''بے ایمان'' چہرہ جو میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا وہ میجر سردار ہرچرن سنگھ صاحب کا تھا، جو پاک فوج کے پہلے، اور فی الحال اکلوتے، کمشنڈ سکھ افسر ہیں۔ سراج الحق صاحب کی منطق کے مطابق ایمان اور تقویٰ سے عاری ہیں لہٰذا (خاکم بدہن) بے اعتبارے ہیں، ان سے (خاکم بدہن بارِ دگر) پاکستان کے دفاع کی توقع رکھنا فضول ہے کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ تو غیر مسلموں پہ فرض ہی نہیں۔ اسی طرح جناب سراج الحق صاحب کی منطق سے رُوشناس ہوجانے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے آنے والا دوسرا ''بے ایمان'' چہرہ ایک ایسے نوجوان پاکستانی ہندو فوجی کا اُبھرا جس نے گزشتہ برس سنہ 2017 میں پاکستان کی دھرتی کی رکھوالی کرتے ہوئے اپنی جان قربان کردی۔ میری مراد 27 سالہ لانس نائک لال چندرابڑی سے ہے جس کا تعلق بدین کے ایک راجپوت ہندو گھرانے سے تھا۔

https://tribune.com.pk/story/1421648/homeland-love-hindu-soldier-died-defence-pakistan/

اور پھر اسی طرح سنہ 2013 میں نارتھ وزیرستان میں دہشت گردوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان کی قربانی دینے والے پاکستانی ہندو فوجی اشوک کمار کا چہرہ بھی آنکھوں کے سامنے اُبھر کر آیا جسے 2015 میں تمغہ شجاعت سے نوازا گیا۔ غالباً اشوک کمار کی فیملی ہی تھی جس نے حکومت پاکستان سے درخواست کی تھی کہ وطن کی خاطر جان قربان کرنے والے دیگر فوجیوں کی طرح اشوک کمار کو بھی ''شہید'' قرار دیا جائے کیونکہ ان کے عقیدے میں بھی وطن کی خاطر جان قربان کرنے والا ''شہید'' ہی کہلاتا ہے، لیکن اشوک کمار کی فیملی کی یہ درخواست مسترد کرکے اسے ''آنجہانی'' کے علاوہ کچھ نہیں قرار دیا گیا۔ میرے نزدیک تو آنجہانی قرار دینا اس لئے بہتر ہے کہ جناب سراج الحق صاحب جس ایم ایم اے نامی سیاسی مذہبی گروہ کے سرکردہ ممبر ہیں، اس کے سربراہ ''حضرت مولانا'' فضل الرحمٰن صاحب نے تو ''شہید'' کے رُتبے کی یہ تعریف بیان فرمائی ہوئی ہے کہ ''امریکہ کے حملے کی زد میں آکر مرنے والا کتا بھی شہید ہوتا ہے۔''

https//:www.express.pk/story/193140

اگر سراج الحق صاحب کے ہمجولی، ایم ایم اے کے سربراہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں شہادت کے رُتبے بانٹنے کے ٹھیکیدار بن کر ڈرون حملوں میں مرنے والے کتوں کو (خاکم بدہن) شہید قرار دیتے پھرتے ہیں تو اشوک کمار کے گھر والے باز ہی رہیں اس قسم کی درخواستیں دینے سے۔ لال چند اور اشوک کمار کی فیملیاں اتنا ہی غنیمت جانیں کہ پاک فوج کا ماٹو ''ایمان، تقویٰ، جہاد فی سبیل اللہ'' ہونے اور اس کی رُو سے سراج الحق صاحب کی نظروں میں ''بے ایمان'' ہونے کے باوجود انہیں پاک فوج میں بھرتی کرلیا گیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ سراج الحق صاحب اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے ایک اور ہم پلہ ہم مشرب ہم پیشہ ہم جولی جناب ''حضرت مولانا'' عبدالعزیز صاحب (لال مسجد فیم) تو پاک فوج میں شامل مسلمان فوجیوں کے جنازے پڑھنا بھی جائز نہیں سمجھتے۔ (روزنامہ دنیا 9 فروری 2014۔ کالم نذیر ناجی) اس لئے خاطر جمع رکھیئے، یہاں تو لال مسجد کے ''مجاہدین'' کے مقابلے میں مارے جانے والے مسلمان (لہٰذا صاحبِ ایمان، متقی اور جہاد فی سبیل اللہ پہ ایمان رکھنے والے) بھی ''شہید'' تسلیم نہیں کئے جارہے، ان کے جنازے پڑھنا بھی حرام ہیں، آپ تو پھر ہندو ہیں!۔

واعظ نہ پی سکو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

جناب سراج الحق صاحب جس جماعت کے موجودہ امیر ہیں اس کے بانی مبانی جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تو ایک ایسا فتویٰ ارشاد فرمایا تھا جس نے کیا مسلم اور کیا غیر مسلم سب کے لئے پاک فوج میں بھرتی ہونا حرام قرار دے دیا تھا (روزنامہ پاکستان 25 نومبر 1995۔ کالم حامد میر بعنوان ''یہ بکواس کبھی بند نہیں ہوگی'') اس فتوے کے بعد تو یہ بحث ہی سرے سے ختم ہوجانی چاہیئے کہ پاک فوج کا ماٹو کیا ہے، اور اس ماٹو کے تحت کون اس میں بھرتی ہوسکتا ہے اور کون نہیں۔ مودودی صاحب کے مبینہ بیک جنبش قلم فتوے نے تو ساری بحثوں ہی نہیں، سارے ''سیٹ اپ'' پہ ہی جھاڑو پھیر کے رکھ دی۔ اکیس سالہ احمدی سپاہی قاضی محمد شوکت غنی پسنی (بلوچستان) میں اور سولہ سترہ برس کا مسیحی جوان ہارون جاوید مسیح تیراہ (خیبر پختونخوا) میں پاک فوج کے دو مختلف امن مشنوں میں حصہ لیتے ہوئے دہشت گردوں کا نشانہ بننے والے بھی پاکستان کے ان محسنوں میں سے ہیں جن کے چہرے راقم کی نظروں میں گھوم رہے ہیں۔ یہ دونوں بھی سراج الحق صاحب کے نقطہ نظر اور منطق کی رُو سے ایمان سے عاری، تقویٰ سے خالی فوجی تھے، ان پر بھی پاک فوج کے دروازے بند ہونے چاہئے تھے۔ مسیحی برادری کے میجر جنرل جولین پیٹر اور میجر جنرل نوئل اسرائیل کھوکھر پتہ نہیں سراج الحق صاحب جیسے غیرت مند دینی رہنما کی عین آنکھوں تلے پاک فوج کے ان اعلیٰ عہدوں تک جا پہنچے؟۔ گروپ کیپٹن سیسل چوہدری (ستارہ جرأت، تمغہ جرأت) بھی مسیحی تھے، 65 کی جنگ میں بھارتی فضائیہ کے خلاف فضائی لڑائیوں میں اعلیٰ ترین کارکردگی دکھا کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ سراج الحق صاحب کا انٹرویو سن کر ماضی کی طرف لوٹتے ہوئے میری نگاہوں نے پھر مزید جن چہروں کو دیکھا ان میں پاکستان کے دفاع میں جان قربان کرنے والے پہلے اور تادمِ تحریر واحد پاکستانی جرنیل میجر جنرل افتخار خان جنجوعہ (دو بار ہلال جرأت، ستارہ پاکستان، ستارہ قائداعظم) کا چہرہ تھا۔ ان کے نام پر چھمب کا نام افتخار آباد، کھاریاں میں ایک کالونی اور ایک کالج کا نام رکھا گیا۔ ان کا تعلق جماعت احمدیہ سے تھا جو سرکاری اور آئینی کافر قرار دیئے جانے کے باعث سراج الحق صاحب کی منطق کی رُو سے پاک فوج کے ایک ''بے ایمان جرنیل'' تھے۔ یہ بھی عجیب (حسنِ) اتفاق ہے کہ بنگلہ دیش کے معرضِ وجود میں آتے وقت بھارتی فوجیوں کے سامنے جس پاکستانی جرنیل نے ہتھیار ڈالے تھے وہ احمدی نہ تھا۔ محترم سراج الحق صاحب کا ہم عقیدہ اور ہم مسلک تھا۔ احمدی ہوتا تو ساری دنیا میں شور مچادیا جاتا (اور اب تک بلکہ رہتی دنیا تک یہ واویلا جاری رکھا جاتا) کہ دیکھو جنرل اے کے نیازی قادیانی تھا اس لئے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگر ''مسلمان'' ہوتا تو مرجاتا لیکن ہندو کے آگے ہتھیار کبھی نہ پھینکتا۔ غالباً پہلے سے مطعون اور معتوب احمدیہ کمیونٹی کو قدرت مزید ستم بالائے ستم سے بچانا چاہتی تھی۔ گو اب بھی پاکستان کو دولخت کرنے کا سہرا زبردستی جماعت احمدیہ کے متھے ہی باندھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پاک فوج کے احمدی افسران میں وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں میں میجر قاضی بشیر احمد، میجر منیر احمد، سکوڈرن لیڈر خلیفہ منیر الدین، کیپٹن مجیب فقیر اللہ بھی ان محب وطن محسنوں میں سے ہیں جو سراج الحق صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق بے ایمان، ناقابل اعتبار تھے۔ سراج الحق صاحب جس جہاد فی سبیل اللہ پہ یقین رکھتے ہیں، یہ احمدی افسران اس قسم کے جہاد پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ بریگیڈئر (بعدہ میجر جنرل) عبدالعلی ملک (ہلال جرأت) کا نام شاید آج کی پاکستانی نسل نے نہ سنا ہو۔ ماہنامہ حکایت پاکستان نے ان کا تعارف کچھ یوں لکھا تھا: ''سیالکوٹ چونڈہ سیکٹر پر بھارت نے پورے آرمرڈ

ڈویژن سے حملہ کیا تھا۔اس حملے کو ایک قادیانی بریگیڈئر نے صرف ایک ٹینک رجمنٹ اور دو انفنٹری پلٹنوں سے روکا تھا۔اس بریگیڈئر کا نام عبدالعلی ملک ہے''

(حکایت۔نومبر 1986 ص 114)

قارئین کے لئے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ مشہور اہلحدیث رسالہ ''الاعتصام'' کے مدیر صاحب نے سنہ پینسٹھ کی پاک بھارت جنگ کو احادیث میں مروی ''غزوہِ ہند'' کا مصداق قرار دے دیا تھا۔اس ''غزوہ'' میں حصہ لینے والے اس قادیانی بریگیڈئر عبدالعلی کے علاوہ ان کے بھائی لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک (ہلال جرأت) بھی سراج الحق صاحب کی منطق کے مطابق پاک فوج کے ایک ''بے ایمان'' جرنیل تھے۔لگتا ہے احمدیوں کے اَزلی اَبدی مخالف آغا شورش کاشمیری صاحب کو جنرل اختر حسین ملک کے ''بے ایمان'' ہونے کا علم نہ تھا ورنہ ان کی شان میں مندرجہ ذیل اشعار ہرگز شائع نہ فرماتے:

دہلی کی سرزمیں نے پکارا ہے ساتھیو
اختر ملک کا ہاتھ بٹاتے ہوئے چلو
اس کے سوا جہاد کے معنی ہیں اور کیا
اسلام کا وقار بڑھاتے ہوئے چلو

(ہفت روزہ چٹان، لاہور۔13 ستمبر 1965 صفحہ 6)

شورش کاشمیری صاحب پہ ہی بس نہیں ،الحاج مولانا عرفان رُشدی صاحب داعی مجلس علمائے پاکستان نے قادیانی بریگیڈئر عبدالعلی کے بارہ میں کیا فرمایا تھا؟۔سنیے:

''کر رہا تھا غازیوں کی جب کماں عبدالعلی
تھا صفوں میں مثل طوفاں رواں عبدالعلی''

(معرکہ حق و باطل۔ص 73)

ایک ''بے ایمان'' جنرل اختر ملک اور جہاد؟۔''غیر مسلم'' تقویٰ سے عاری اور اسلام کا وقار بڑھانے والا؟۔''بے ایمان'' قادیانی جنرل عبدالعلی اور ''غزوہ ہند'' کے ''غازیوں'' کا کماندار؟ پاک فوج کا ماٹو ؟ کچھ بھی تو پلے نہیں پڑ رہا۔یا تو آغا شورش اور مولانا عرفان کی عقلیں گھاس کھا گئی تھیں اور یا پھر محترم سراج الحق صاحب کی!۔

***

مسجد کا مولوی۔ سید وجاہت علی

مولوی صاحب بڑی جاں فشانی سے گند سے اٹی ہوئی نالی کو ایسی مہارت سے صاف کر رہے تھے جیسے یہ انکا خاندانی پیشہ ہو۔آج اچانک بیٹھے بٹھائے مولوی صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہ جمعہ کے خطبے میں صفائی کی اہمیت پہ ایک جامع، مدلل اور پر اثر خطاب کرنیکے بعد اپنے گھر کی ضروری صفائی شروع کر دی اور اسی پہ بس نہیں کیا بلکہ اسکے بعد مولوی صاحب نے باہر گلی کی نالی کو صاف کرنا شروع کر دیا اور بغیر کسی وقفے کے نالی بلکہ نالیاں صاف کرتے رہے۔گزرنے والوں کی رسمی سلام دعا نے بھی مولوی صاحب کے کام کی صفائی اور رفتار پہ کچھ فرق نہ ڈالا۔مغرب کی اذان سے کچھ پہلے مولوی صاحب نے ہاتھوں سے شاپر اتارے نامکمل آلات صفائی اٹھائے ،نہا کے کپڑے بدلے اور مسجد کو ہو لئے .اگلے دن فجر کی نماز کے بعد بچوں کو سپارہ پڑھا کے وہیں سے کام کا دوبارہ آغاز کیا جہاں سے کل شام چھوڑا تھا۔گو کہ مولوی صاحب پہلے ہی اپنے گھر کی حدود سے آگے نکل آئے تھے۔دن چڑھے مولوی صاحب گلی کے دونوں اطراف کی نالیاں صاف کر چکے تھے۔آٹھ دس گھروں کی نالیاں....اور ابھی تو کام ذوق وشوق سے جاری تھا. سادات کا گاؤں تھا لوگ بھی اپنی ذات برادری کے تھے ظاہر ہے مولوی صاحب خود بھی حسبی نسبی سید تھے.مولوی صاحب کو یوں گندی نالیاں صاف کرتے ہوئے دیکھ کر چند معززین نے صلح دی کہ آپ برائے کرم یہ سب نہ کریں.کسی چوڑے کو بلا لیتے ہیں۔سادات کے شایاں نہیں کہ وہ نالیوں میں ہاتھ مارتے پھریں۔پھر اوپر سے آپ امام مسجد ہیں۔ہو جائے گی صفائی آپ برائے کرم اب بس کریں۔

مولوی صاحب نے شکریہ کے ساتھ جواب میں صرف اتنا کہا کہ آپ اگر اجرت پر صفائی کروانا چاہتے ہیں تو اچھی بات ہے مگر.میرے کام کو تو حقیر نہ کہیں۔مولوی صاحب پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ظہر کی نماز تک محلے کے ایک دو لڑکے بھی ساتھ ہو لئے.کل کی طرح مولوی صاحب نے ہر نماز پڑھانے کے بعد اپنا کام شروع رکھا۔بظاہر ایسا لگتا تھا کہ یہ دو چار بندوں کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس پیچیدہ اور گندے کام کو ایک گلی کی حد تک ہی سہی پورا کر لیں گے.لیکن دو دن میں دیکھتے ہی دیکھتے مولوی صاحب نے بارہ تیرہ گھروں پر مشتمل گلی کی دو رویا نالیاں ایسے صاف کر دیں کہ لوگوں نے کافی

مدت کے بعد نالیوں کی اندرونی ساخت کا مشاہدہ کیا۔آج تیسرا دن تھا کام حسب معمول فجر کی نماز کے بعد شروع ہو چکا تھا۔لڑکے بھالے بھی دیکھا دیکھی ذرا بہتر انتظامات کے ساتھ مولوی صاحب کے شریک ہو گئے.اور دو تین گلیاں شام تک اپنی صفائی کیآپ گن گا رہی تھیں۔شام کو مغرب کی نماز کے بعد چند معززین دیہہ نے مولوی صاحب کو مسجد میں ہی روک لیا اور سمجھایا کہ ہم مل کر صفائی کے بارے کوئی معقول حل تلاش کرتے ہیں اور برائے کرم آپ اپنے منسب کا کچھ خیال کریں!!! مولوی صاحب نے جواب دیا کے میرا منسب امامت یا ساداتی کسی بھی حوالے سے مجھے اس کام سے نہیں روکتی!امام اور سید کا کام ہی معاشرتی گند کو صاف کرنا ہے چاہے گند ظاہری ہو یا باطنی.. نبی کریم ص نے نہ تو بڑھیا کے گھر کا رستہ تبدیل کیا اور نہ ہی اونٹ کی اوجڑی کی ظاہری غلاظت کے خوف سے نماز چھپ کر پڑھی...کیونکہ آپ نے عرب بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کا ظاہری اور باطنی گند صاف کر کے پاک کرنا تھا اس لئے آپ نے کبھی پتھروں،طعنوں، بائیکاٹ یا ظاہری غلاظت کو اپنے مقصد عظیم میں نہیں آنے دیا...میری کیا مجال کہ میں ڈیڑھ انچ کی مسجد میں دو رکعت کا امام اپنی ساداتی کی اکڑ میں آپ ص کے مقصد عظیم میں آنے والی نالی کو رکاوٹ سمجھ لوں...آج چوتھا دن تھا اور مولوی صاحب کے ساتھ صفائی میں پورا گاؤں تھا...وہ ایسے کہ سب نے اپنے اپنے گھر کے سامنے سے مکمل صفائی شروع کر دی اور اکثریت نے تو اس بات کی بھی تمیز چھوڑ دی کہ یہ کسکا گھر ہے۔یہ بات سب پہ واضع ہو چکی تھی کہ مولوی صاحب سب گلیوں کی نالیاں صاف کر کے ہی دم لیں گے...ہفتے بھر میں پورا گاؤں پیرس بن گیا..اب مولوی صاحب نے سب کو مسجد میں بلا کر لائحہ عمل طے کیا کہ کیسے صفائی سے متعلق امور کو چلانا ہے..جمعہ بھر آ گیا اس دفعہ خطبہ جمعہ میں مولوی صاحب کا موضوع صلاح رحمی اور بھائی چارہ تھا..مولوی صاحب نے قرآن و احادیث اور دنیا کی منظم اقوام کے حوالے سے اس کے فوائد اور قطع رحمی کے نقصانات پر روشنی ڈالی..جسکا اچھا خاصا اثر ہوا لیکن بات آگے نہ بڑھ پاتی اگر مولوی صاحب عملاً ذمہ داری نہ لیتے۔جمعہ کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے بتایا کہ مرے علم میں ہے کہ چند احباب آپس میں ایک دوسرے سے ناراض ہیں...میں ابھی اسی وقت ان سے ملوں گا آپ میں سے مرے ساتھ کوئی آنا چاہے تو یہ زیادہ بہتر ہے.چند بزرگ مولوی صاحب کے ساتھ ہو لئے..اور پھر پورا ہفتہ مولوی صاحب کی سرپرستی میں صلاح رحمی پہ کام ہوا اور سوائے ایک آدھ مسئلے کے گاؤں میں احترام اور صلاح جوئی کی فضا قائم ہوگئی ناراضگیاں دوستیوں میں بدل گئیں...چاروں اطراف عجیب سی طمانیت اور برکت سی پھیلی ہوئی تھی...صاف ستھرا گاؤں ڈرنہ خوف....ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو اور ہر برائی نیکی میں بدل دی گئی ہو..دو ہفتوں میں سب بدل گیا تھا.آج پھر جمعہ تھا...اللہ اکبر....اذان شروع ہوئی تو میں نے خلاف معمول تیزی دکھائی...اور اذان ختم ہونے تک گھر سے تیار ہو کر مسجد کی طرف تیز تیز قدم بڑھانا شروع کر دیے..کافی دیر حواس باختہ سا ہو کر مسجد ڈھونڈتا رہا....نہیں ملی....آج تک مجھے نہ وہ مسجد ملی ہے نہ وہ مولوی صاحب...اگر آپ کو کہیں ملیں تو مجھے ضرور بتائیے گا...

امجد مرزا امجد کے ساتھ چند قہقہے

بھیانک چیز

''کہاں سے آرہے ہو؟''''نمائش سے''''کیا دیکھا وہاں؟''ایک بم کا ماڈل دیکھا ہے بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اس سے بھیانک کوئی چیز نہیں۔''

''کیا تم شادی شدہ ہو؟''''نہیں!''''اونہہ! پھر تمہیں کیا پتہ کہ دنیا کی بھیانک ترین چیز کسے کہتے ہیں۔''

نسخہ

ایک مریض نے جب ڈاکٹر کو اپنی ان گنت بیماریوں کی تفصیل سنانی شروع کی تو ڈاکٹر بیزار ہو کر بولا۔''بس بس! میں تمہارے لئے ایک نہایت موزوں چیز لکھ کے دے رہا ہوں۔''

مریض نے خوش ہو کر پوچھا۔''کیا آپ کو نیا نسخہ لکھ کریں گے؟''

''ہاں!''ڈاکٹر نے جواب دیا۔''گورکن کے نام ایک تعارفی خط۔''

اصل وجہ

ایک تاجر نے دوسرے تاجر کو بہت سا مال ادھار دے رکھا تھا اور تقاضوں کے باوجود وہ ادھار واپس نہیں کر رہا تھا۔تنگ آ کر اس نے ایک نفسیاتی گر آزمانے کی ٹھانی اور مقروض کو اپنی ننھی منی بھولی بھالی سی بیٹی کی تصویر روانہ کی اور پشت پر لکھا۔''یہ ہے اصل وجہ رقم مانگنے کی''چند دنوں کے بعد اسے اس کے مقروض تاجر نے ایک نہایت حسین جوان لڑکی کی تصویر بھیجی جس کی پشت پر لکھا تھا۔''اور یہ ہے اصل وجہ رقم ادا نہ کرنے کی۔''

بہادر شاہ ظفر

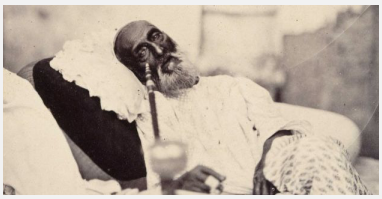

عاصی صحرائی

جب ہندوستان کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو میکنن میکنزی بحری جہاز میں بٹھادیا گیا۔ یہ جہاز 17 اکتوبر 1858ء کو رنگون پہنچ گیا، شاہی خاندان کے 35 مرد اور خواتین بھی تاج دار ہند کے ساتھ تھیں، کیپٹن نیلسن ڈیوس رنگون کا انچارج تھا، وہ بندرگاہ پہنچا، اس نے بادشاہ اور اس کے حوالیوں کو وصول کیا، رسید لکھ کر دی اور دنیا کی تیسری بڑی سلطنت کے آخری فرمانروا کو ساتھ لے کر اپنی رہائش گاہ پر آ گیا، نیلسن پریشان تھا، بہادر شاہ ظفر قیدی ہونے کے باوجود بادشاہ تھا اور نیلسن کا ضمیر گوارہ نہیں کر رہا تھا وہ بیمار اور بوڑھے بادشاہ کو جیل میں پھینک دے مگر رنگون میں کوئی ایسا مقام نہیں تھا جہاں بہادر شاہ ظفر کو رکھا جا سکتا، وہ رنگون میں پہلا جلا وطن بادشاہ تھا، نیلسن ڈیوس نے چند لمحے سوچا اور مسئلے کا دلچسپ حل نکال لیا، نیلسن نے اپنے گھر کا گیراج خالی کرایا اور تاجدار ہند، ظلِ سُبحانی اور تیموری لہو کے آخری چشم و چراغ کو اپنے گیراج میں قید کر دیا، بہادر شاہ ظفر 17 اکتوبر 1858ء کو اس گیراج میں پہنچا اور 7 نومبر 1862ء تک چار سال وہاں رہا، بہادر شاہ ظفر نے اپنی مشہور زمانہ غزل ''لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں'' ''کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں'' اور ''کتنا بدنصیب ہے ظفر دفن کے لئے''... ''دو گز زمین بھی نہ مل سکی کوئے یار میں''

اسی گیراج میں لکھی تھی، یہ 7 نومبر کا خنک دن تھا اور سن تھا 1862ء، بدنصیب بادشاہ کی خادمہ نے شدید پریشانی میں کیپٹن نیلسن ڈیوس کے دروازے پر دستک دی، اندر سے اردلی نے برمی زبان میں اس بدتمیزی کی وجہ پوچھی، خادمہ نے ٹوٹی پھوٹی برمی زبان میں جواب دیا، ظلِ سُبحانی کا سانس اکھڑ رہا ہے، اردلی نے جواب دیا، صاحب کتے کو کنگھی کر رہے ہیں، میں انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا، خادمہ نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا، اردلی اسے چپ کرانے لگا مگر آواز نیلسن تک پہنچ گئی۔ وہ غصے سے باہر نکلا، خادمہ نے نیلسن کو دیکھا تو وہ اس کے پاؤں میں گر گئی، وہ مرتے ہوئے بادشاہ کے لئے گیراج کی کھڑکی کھلوانا چاہتی تھی۔ بادشاہ موت سے پہلے آزاد اور کھلی ہوا کا ایک گھونٹ بھرنا چاہتا تھا، نیلسن نے اپنا پسٹل اٹھایا، گارڈ کو ساتھ لیا، گیراج میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ کی آخری آرام گاہ کے اندر بدبو، موت کا سکوت اور اندھیرا تھا، اردلی لیمپ لے کر بادشاہ کے سرہانے کھڑا ہو گیا، نیلسن آگے بڑھا، بادشاہ کا کمبل آدھا بستر پر اور آدھا فرش پر، اُس کا ننگا سر تکیئے پر تھا لیکن گردن ڈھلکی ہوئی تھی، آنکھوں کے ڈھیلے پپوٹوں کی حدوں سے باہر اُبل رہے تھے، گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور خشک زرد ہونٹوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، نیلسن نے زندگی میں ہزاروں چہرے دیکھے تھے لیکن اس نے کسی چہرے پر اتنی بے چارگی، اتنی غریب الوطنی نہیں دیکھی تھی، وہ کسی بادشاہ کا چہرہ نہیں تھا۔ وہ دنیا کے سب سے بڑے بھکاری کا چہرہ تھا اور اس پر ایک آزاد سانس، جی ہاں... صرف ایک آزاد سانس کی اپیل تحریر تھی اور یہ اپیل پرانے کنوئیں کی دیوار سے لپٹی کائی کی طرح ہر دیکھنے والی آنکھ کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ کیپٹن نیلسن نے بادشاہ کی گردن پر ہاتھ رکھا، زندگی کے قافلے کو رگوں کے جنگل سے گزرے مدت ہو چکی تھی۔ ہندوستان کا آخری بادشاہ زندگی کی حد عبور کر چکا تھا۔ نیلسن نے لواحقین کو بلانے کا حکم دیا۔

لواحقین تھے ہی کتنے ایک شہزادہ جوان بخت اور دوسرا اس کا استاد حافظ محمد ابرہیم دہلوی، وہ دونوں آئے، انہوں نے بادشاہ کو غسل دیا، کفن پہنایا اور جیسے تیسے بادشاہ کی نمازِ جنازہ پڑھی، قبر کا مرحلہ آیا تو پورے رنگون شہر میں آخری تاجدارِ ہند کے لئے دو گز زمین دستیاب نہ تھی، نیلسن نے سرکاری رہائش گاہ کے احاطے میں قبر کھدوائی اور بادشاہ کو خیرات میں ملی ہوئی مٹی میں دفن کر دیا۔ قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ گلاب کی پتیاں بکھیری جا رہی تھیں تو استاد حافظ ابراہیم دہلوی کے خزاں رسیدہ ذہن میں 30 ستمبر 1837ء کے وہ مناظر دوڑنے بھاگنے لگے۔ جب دہلی کے لال قلعے میں 62 برس کے بہادر شاہ ظفر کو تاج پہنایا گیا۔ ہندوستان کے نئے بادشاہ کو سلامی دینے کے لئے پورے ملک سے لاکھ لوگ دلی آئے تھے اور بادشاہ جب لباسِ فاخرہ پہن کر تاجِ شاہی سر پر سجا کر اورنادر شاہی اور جہانگیری تلواریں لٹکا کر دربارِ عام میں آیا تو پورا دلی تحسین تحسین کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ نقارچی نقارے بجانے لگے اور رقاصائیں رقص کرنے لگیں، استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی کو یاد تھا بہادر

شاہ ظفر کی تاج پوشی کا جشن سات دن جاری رہا اور ان سات دنوں میں دِلی کے لوگوں کو شاہی محل سے کھانا کھلایا گیا مگر سات نومبر 1862ء کی اس ٹھنڈی اور بے مہر صبح بادشاہ کی قبر کو ایک خوش الحان قاری تک نصیب نہ تھا۔ استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے جوتے اتارے بادشاہ کی قبر کی بائینتی میں کھڑا ہوا اور سورۃ توبہ کی تلاوت شروع کر دی۔

حافظ ابراہیم دہلوی کے گلے سے سوز کے دریا بہنے لگے، یہ قرآن مجید کی تلاوت کا اعجاز تھا یا پھر استاد ابراہیم دہلوی کے گلے کا سوز۔ کیپٹن نیلسن ڈیوس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے ہاتھ اٹھایا اور اس غریب الوطن قبر کو سیلوٹ پیش کر دیا اور اس آخری سیلوٹ کے ساتھ ہی مغل سلطنت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ آپ اگر کبھی رنگون جائیں تو آپ کو ڈیگن ٹاؤن شِپ کی کچی گلیوں کی بدبودار جھگیوں میں آج بھی بہادر شاہ ظفر کی نسل کے خاندان مل جائیں گے۔ یہ آخری مُغل شاہ کی اصل اولاد ہیں مگر یہ اولاد آج سرکار کے وظیفے پر چل رہی ہے۔ یہ کچی زمین پر سوتی ہے، ننگے پاؤں پھرتی ہے، مانگ کر کھاتی ہے اور ٹین کے کنستروں میں سرکاری نل سے پانی بھرتی ہے۔ مگر یہ لوگ اس کسمپرسی کے باوجود خود کو شہزادے اور شہزادیاں کہتے ہیں۔ یہ لوگوں کو عہد رفتہ کی داستانیں سناتے ہیں اور لوگ قہقہے لگا کر رنگون کی گلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ، یہ شہزادے اور شہزادیاں کون ہیں؟ یہ ہندوستان کے آخری بادشاہ کی سیاسی غلطیاں ہیں، بادشاہ نے اپنے گرد نااہل، خوشامدی اور کرپٹ لوگوں کا لشکر جمع کر لیا تھا، یہ لوگ بادشاہ کی آنکھیں بھی تھے، اس کے کان بھی اور اس کا ضمیر بھی، بادشاہ کے دو بیٹوں نے سلطنت آپس میں تقسیم کر لی تھی۔ ایک شہزادہ داخلی امور کا مالک تھا اور دوسرا خارجی امور کا مختار، دونوں کے درمیان لڑائی بھی چلتی رہتی تھی اور بادشاہ ان دونوں کی ہر غلطی، ہر کوتاہی معاف کر دیتا تھا، عوام کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ مہنگائی آسمان کو چھو رہی تھی، خوراک منڈیوں سے کٹائی کے موسموں میں غائب ہو جاتی تھی۔ سوداگر منہ مانگی قیمت پر لوگوں کو گندم، گڑ اور ترکاری بیچتے تھے، ٹیکسوں میں روز اضافہ ہوتا تھا، شہزادوں نے دلی شہر میں کبوتروں کے دانے تک پر ٹیکس لگا دیا تھا۔ طوائفوں کی کمائی تک کا ایک حصہ شہزادوں کی جیب میں چلا جاتا تھا۔ شاہی خاندان کے لوگ قتل بھی کر دیتے تھے تو کوئی ان سے پوچھ نہیں سکتا تھا، ریاست شاہی دربار کے ہاتھ سے نکل چکی تھی، نواب، صوبیدار، امیر اور سلطان آزاد ہو چکے تھے اور یہ مغل سلطنت کو ماننے تک سے انکاری تھے، فوج تلوار کی نوک پر بادشاہ سے جو چاہتی تھی منوا لیتی تھی، عوام بادشاہ اور اس کے خاندان سے بیزار ہو چکے تھے، یہ گلیوں اور بازاروں میں بادشاہ کو ننگی گالیاں دیتے تھے اور کوتوال چپ چاپ ان کے قریب سے گزر جاتے تھے جب کہ انگریز مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔ یہ روز معاہدہ توڑتے تھے اور شاہی خاندان وسیع تر قومی مفاد میں انگریزوں کے ساتھ نیا معاہدہ کر لیتا تھا۔ انگریز بادشاہ کے وفاداروں کو قتل کر دیتے تھے اور شاہی خاندان احتجاج کرتا تھا تو انگریز بادشاہ کو یہ بتا کر حیران کر دیتا تھا، ''ظلِ الٰہی وہ شخص آپ کا وفادار نہیں تھا، وہ ننگ انسانیت آپ کے خلاف سازش کر رہا تھا'' اور بادشاہ اس پر یقین کر لیتا تھا، بادشاہ نے طویل عرصے تک اپنی فوج بھی ٹیسٹ نہیں کی تھی چنانچہ جب لڑنے کا وقت آیا تو فوجیوں سے تلواریں تک نہ اٹھائی گئیں۔ ان حالات میں جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی اور بادشاہ گرتا پڑتا شاہی ہاتھی پر چڑھا تو عوام نے لاتعلق رہنے کا اعلان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے ہمارے لئے بہادر شاہ ظفر یا الیگزنڈر اوکٹوریا دونوں برابر ہیں۔ مجاہدین جذبے سے لبریز تھے لیکن ان کے پاس قیادت نہیں تھی۔ بادشاہ ڈبل مائینڈڈ تھا، یہ انگریز سے لڑنا بھی چاہتا تھا اور اپنی مدت شاہی بھی پوری کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس جنگ کا وہی نتیجہ جو ڈبل مائینڈ ہو کر لڑی جانے والی جنگوں کا نکلتا ہے، شاہی خاندان کو دلی میں ذبح کر دیا گیا جب کہ بادشاہ جلاوطن ہو گیا۔ بادشاہ کیپٹن نیلسن ڈیوس کے گیراج میں قید رہا، گھر کے احاطے میں دفن ہوا اور اس کی اولاد آج تک اپنی عظمت رفتہ کا ٹوکرہ سر پر اُٹھا کر رنگون کی گلیوں میں پھر رہی ہے۔ یہ لوگ شہر میں نکلتے ہیں تو ان کے چہروں پر صاف لکھا ہوتا ہے، جو بادشاہ اپنی سلطنت، اپنے مینڈیٹ کی حفاظت نہیں کرتے، جو عوام کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں، ان کی اولادیں اسی طرح گلیوں میں خوار ہوتی ہیں۔ یہ عبرت کا کشکول بن کر اسی طرح تاریخ کے چوک میں بھیک مانگتی ہیں، لیکن ہمارے حکمرانوں کو یہ حقیقت سمجھ نہیں آتی۔ یہ خود کو بہادر شاہ ظفر سے بڑا بادشاہ سمجھتے ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

***

شائق نصیر پوری کا اندازِ سُخن

امجد مرزا امجد

اصل نام محمد رمضان اور ادبی نام شائق نصیر پوری سے جانے جاتے ہیں۔ میری پہلی ملاقات رانا عبدالرزاق صاحب کے مشاعرے میں ہوئی۔ دیکھا کہ ایک مخنی سا بزرگ ہاتھ میں چھڑی تھامے نہایت مصروف ہال میں ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ اور پھر جب ان کا نام پکارا گیا تو اپنی پنجابی مزاحیہ نظموں سے محفل میں رنگ بکھیر دیئے۔۔ان سے بات چیت تو نہ ہوسکی مگر دل کے ایک کونے میں وہ براجمان سے ہوگئے۔ اسی طرح چند ایک مشاعروں میں جاتے ہوئے ان سے سلام و دعا ہوئی وہ بھی ایک بار میرے مشاعرے میں آئے۔ دونوں جانب خلوص اور سانجھی دلچسپی ہو تو ایک تعلق استوار ہو جاتا ہے۔ اور رمضان صاحب جیسا بے غرض محبت بھرا دل رکھنے والا شخص ہو تو بھائی چارے اور دوستی کے راستے ہموار ہو جاتے ہیں۔۔اور پھر ہمارے درمیان ایک اور تعلق بھی پیدا ہو گیا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''شامِ سخن'' میرے استاد محترم اور نہایت مخلص بھائی نما دوست جناب ڈاکٹر منور احمد کنڈے کی وساطت سے شائع کرنے کا موقع ملا۔ اس کتاب میں مجھے مضمون لکھنے کو بھی کہا گیا جو میں اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ بنام ''شب تابِ سخن'' کا سرورق اور اسے شائع کرنے کا سہرا بھی میرے سر رہا۔۔ان دونوں کتابوں نے جہاں مصنف کو برطانیہ کے صفِ اول کے شعرا میں کھڑا کر دیا وہاں مجھے ایک نہایت مخلص حلیم الطبع اور پیارا دوست ملا۔

محمد رمضان ایک سچے کھرے اور سادہ طبیعت کے مذہبی رجحان کے انسان ہیں۔ لین دین میں نہایت کھرا پایا بلکہ ہر کتاب کی قیمت ادا کرتے وقت اصرار کے ساتھ مٹھائی کے پیسے الگ سے دیئے۔۔ سچی بات ہے میں نے اپنے پبلشنگ ادارے ''سویرا اکیڈیمی'' سے اب تک بائیس کتابیں لندن سے شائع کیں مگر ایسی محبت کسی نے بھی نہ جتائی۔!! وہ لکھتے ہیں کہ ان کا بچپن نہایت مشکل حالات میں گزرا باپ کا سایہ ہندوستان سے ہجرت کے دوران ہی سر سے اُٹھ گیا۔ واجبی سی تعلیم کے ساتھ زندگی بھر مزدوری محنت و مشقت میں گزری۔ زندگی میں چار ہجرتوں کے کرب سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان سے پاکستان پھر وہاں سے لیبیا ۔۔وہاں سے جرمنی اور پھر برطانیہ اور لندن میں مقیم ہوئے۔ لندن کی یہی خصوصیت اسے دنیا کے دیگر شہروں سے فضیلت دیتی ہے کہ کوئی ایک بار اس کے دامن میں آ گیا تو اسی کا ہو کر رہ گیا۔۔

اب آیئے محترم شاعر کی شاعری اور کتاب پر کچھ بات چیت کریں۔ آج ان کے دوسرے شعری مجموعے کی تقریب رونمائی ہے جس کی انہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور معذرت بھی کہ چند گھریلو مصرفیات کی وجہ سے اس خوبصورت اور یادگار محفل میں حاضر ہونے سے قاصر رہا جس کی کمی کا احساس دیر تک رہے گا۔ مگر امید ہے کہ یہ مضمون میری حاضری کا موجب ہوگا۔۔''شب تابِ سخن'' کا خوبصورت ادبی نام ہمارے محترم ڈاکٹر منور احمد کنڈے صاحب نے رکھا۔ کتاب کا سرورق بھی اسی روشنی میں بنایا گیا۔ اسی گرام کے سفید کاغذ پر 252 صفحات کی ضخیم کتاب بہت بھلی لگتی ہے۔ اس کی تمام شاعری بقول شاعر گھریلو رشتوں اور کچھ مذہبی و اعتقادی اور مزاح کے موضوع پر ہے۔ چند نہایت خوبصورت غزلیں اور نظمیں بھی ہیں۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کا نہایت خوبصورت سنگم ہے۔ میں پہلے بھی یہ بار دہرا چکا ہوں کہ شائق نصیر آبادی محض دردِ ذات ہی نہیں رکھتے بلکہ دردِ کائنات کو اپنے سینے میں سمونے کا ظرف رکھتے ہیں اور اپنے اشعار کے وسیلے سے اس کے اظہار کا یارا بھی رکھتے ہے۔ ان کی غزلوں نظموں میں ہجر و وصال کے قصے نہیں بلکہ زندگی کی ترش و تلخ حقیقتوں سے آگاہی ہے وہ اپنے اشعار میں بے رحم سچائیوں کے پرخار رستوں سے آگاہ کرتے ہیں اور اپنے خلوص و عزم پر بھروسہ بھی جس کا وہ کھل کر اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک خوبصورت شعر ہے۔

رات کے اک دشت میں برف جمی تھی یادوں کی
راتوں کی بے چینی میں ہی شعر کی آگ جلائی ہے

چونکہ میں نے ان کی ابتدائی شاعری مزاحیہ انداز میں سنی جو بہت پسند آئی ۔مزاح انسانی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے اور دوسروں کے چہروں پر مسکراہٹ لانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ایک فن ہونا چاہیے اور یہ فن ہمارے شاعر کے اندر کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔ وہ مزاح میں بہت گہری اور نصیحت آموز باتیں ہنستے مسکراتے کہہ جاتے ہیں۔ اس مجموعے میں بھی اردو پنجابی میں بے شمار مزاحیہ اشعار ہیں جو مجموعے کو مزید دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ میں اپنے مضمون میں مصنف کی زیادہ نقل لکھ کر صفحات نہیں بھرتا مگر چند ایک اشعار

بطور نمونہ ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

میں پڑھا لکھا شاعر ہوں، لگاتا ہوں انگوٹھا
لِفٹ گر مانگنی ہو تو دکھاتا ہوں انگوٹھا
مشاعرے میں گر سامعیں سے داد نہ ملے
تو خفت مٹانے کو میں چباتا ہوں انگھوٹا

ان کی پنجابی نظم ''کتے دی پوچھل وانگ'' نہایت مزاحیہ ہے جس میں ایک اچھا پیغام بھی ہے۔ اسی طرح بے شمار موضوعات پر اردو اور پنجابی میں نظمیں شامل اشاعت ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔۔آخر میں بہت ہی محترم محمد رمضان شائق نصیر پوری صاحب کو دل کی گہرائیوں سے ڈھیر سی مبارکباد کے ساتھ دلی دعا ہے کہ اللہ پاک انہیں اسی طرح خوبصورت شاعری لکھنے کا کی توفیق عطا کرے اور وہ اپنی قلم کا جادو جگاتے رہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی شاعری میں ہجرتوں کی اذیت نا کی لفظ وشعر کے لباس میں صفحۂ قرطاس پر اترتی ہے تو ان کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا ہے اور راحت وانبساط کی کہکشاں ان کی نظروں میں منور ہو جاتی ہے۔مجھے یقین ہے کہ شائق صاحب اسی طرح لکھتے رہیں گے اور اسی انداز میں لکھتے رہے گے کیونکہ بقول ان کے ؎

بیکار ہے ہر کوشش بدلے گا نہیں شائق
تم لاکھ کہو مجھ سے دیوان بدل ڈالو

غزل

(شمع چوہدری ساؤتھ ویلز یوکے)

یوں تمہیں دل میں بسا رکھا ہے
خود کو سب سے بچا رکھا ہے
ہے خفا مجھ سے زمانہ، میں سے
لب پہ کیوں حرفِ وفا رکھا ہے
ظلمتوں کی نگری میں روز و شب
عشق کا شعلہ جلا رکھا ہے
یہ غمِ ہجراں مسلسل، اللہ
دل نے محشر سا اُٹھا رکھا ہے
پتھروں کے شہر میں کیونکر شمع
آئینہ خود کو بنا رکھا ہے

نواں ماڈل- امجد مرزا امجدؔ

''توں ہی اس واری پاکستان ہو آویں میری طبیعت وی
کجھ چنگی نہیں رہندی تے نالیں دوکان تے وی کم چوکھا ہے...''

نوید نے اپنی بیوی نوں ہولے جیا آکھیا تے انکھاں نیویں کر کے اپر کمرے چہ چلا گیا۔رخسانہ انہوں بڑے غور نال ویکھ رہی سی تے سوچ رہی سی جے چنگے بھلے نوید نوں ہن ہو کی گیا۔ویاہ نوں پندرہ ورھے ہو گئے سن۔بچے وی وڈھے ہو گئے خش باش زندگی گزر رہی سی پر اک سال توں انہوں پتہ نہیں کی اُٹھواں لڑیا جے نہ میرے نال نہ بچیاں نال کوئی پیار دی گل کردا اے۔سارا دن دوکان تے، راتیں ادھی راتیں آ کے کدی روٹی کھادی تے کدی انج ای منہ نویں کیتا اُپر جا ستا۔کئی واری انہوں ڈاکٹر کول جان دا وہ کہیا پر اوہ ہوں ہاں کہہ کے ٹال دیندا...کل ہی پاکستان توں نوید دے بھائی نے فون کیتا جے ماں بوہت بیمار ہے جے آخری واری ملنا ای تے چھیتی نال آ جا۔۔پر نوید نوں ذرا وی فکر نہ ہوئی۔سن کے اس دے منہ توں کوئی فکر یا افسوس دی گل تیک نہ نکلی تے اکھاں نیویاں کر کے کہہ دتا۔جے توں ہی ہوآ...دو جے روز ہی اوہ ٹکٹ لے آیا جہڑا رخسانہ دے ناں سی۔۔ایہہ کنج دا بندہ اے جس دی ماں مر رہی ہے تے آپوں جان دی تھاں مینوں بھیج ریا اے۔رخسانہ نے سوچیا۔''نوید! تینوں خود جانا چاہیا دا اے...ماں تیری ہے ...تینوں ویکھنا چاہندی اے۔۔توں ستاں سالاں توں پاکستان نہیں گیا...اوہ کی سوچن گے جے میں تینوں نہیں جان دیندی...توں جاتے ماں نوں مل اگر انہاں دی حالت اتنی ہی بھیڑی اے تے کجھ دن ٹھہر جائیں...تے فارغ ہو کے واپس آئیں...دوکان دا کم نوکر سنبھال لین گے۔۔گھر دی کوئی فکر نہ کریں...بچے وڈے نیں...میں سب کج سنبھال لواں گی۔'' پر اوہ تکے بغیر نہیں...نہیں...توں ہی جانا اے...جے نہیں جانا تے کہہ دے میں ٹکٹ واپس کر آواں گا...ایہہ کہہ کے گھروں باہر نکل گیا...!!رخسانہ پاکستان تے ہفتے کھنڈلئی گئی پر سس دے مرن توں بعد چالیسیوں تک رہنا پے گیا۔۔جد واپس آئی تے اُس دا وڈا پتر کہن لگا...''ممی! تیرے جان تو بعد ڈیڈی دوتن واری آئے سن تے ڈھیر جئی گروسری دے گئے سن تے۔۔فیر انہاں نوں نہیں ویکھیا ...پر ممی ...!!'' ایہہ کہہ کے میرا پتر کجھ رک گیا تے میں حیران ہو کے پوچھیا تے ہولے جیا بولیا...''دوکان دا نوکر کہندا سی جے نوید صاحب نے دوجا ویاہ کر لیا اے تے دوکان تے وی گھٹ ہی آندے نیں...!!'' رخسانہ دیاں اکھاں تو دو ٹپ ٹپ کر دے اتھرو ٹہہ کے اس دی شال چہ گم ہو گئے...اس نے اپنے پتر نوں اپنیاں باہواں چ لے لیا تے سوچیا...ایہہ مرد وی کیڈی کتی شے ہے۔ہر دس بارہ سال بعد نئے ماڈل دی کار وانگوں بیوی وی بدل دیندا اے...اج آون دے کنجرنوں...!!

***

تیسری شادی

از معصوم خاوند

خاکسار نے آپ تمام دوستوں کو اطلاع دینی تھی کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر خاکسار عاجز نے تیسری شادی کر لی ہے۔ تیسری اہلیہ عمر میں کافی چھوٹی ہیں۔ آپ سب چونکہ میرے بہت عزیز اور محترم دوست ہیں اس لئے وضاحت دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری تیسری شادی ہو جائے گی سوچا نہ تھا معذرت آپ کو پہلے اطلاع نہ کر سکا اور آناً فاناً نکاح ہوا اور رُخصتی ہوئی، دوسری شادی کے ولیمہ طرح پھر آپ کو نہیں بلا سکا۔ لیکن اس دفعہ آپ کی دعوت میں دیر نہیں کروں گا۔ انشاءاللہ حیرت یہ ہے کہ خوشدلی سے میری پہلی اہلیہ نے تیسری اہلیہ کو دوست بنایا، بچے تو ماں کہہ کر لپٹ گئے، تیسری اہلیہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میری نئی بیوی بے انتہا خوش اخلاق خوبصورت خوب سیرت ہیں۔ کسی بات پر اعتراض نہیں کرتی اور میرا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ ابھی میں نے صرف اتنا کہا کہ چائے میں چینی کم ہے تو کہنے لگیں لائیے چائے ہی نئی بنا دیتی ہوں۔ بعض کی اہلیہ تو ایسے موقع پر کبھی کبھی کہہ دیا کرتی ہیں کہ کوئی کام خود بھی کر لیا کریں۔ آپ دوستوں میں سے اکثر اپنے اپنے گھروں میں اس کا تجربہ رکھتے ہوں گے تیسری اہلیہ سے ملاقات پہلی بیگم کے ساتھ ہی ایک شاپنگ سینٹر کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی، اور کب بات شادی تک پہنچ گئی پتہ بھی نہ لگا اور اسی وقت ہماری دوسری بیگم نے ان کو ہمارے لیے پسند کیا۔ دوسری بیگم نے انتہائی ضد کر کے ہمیں ہنی مون پر بھیجنے کی تیاری کر رکھی ہے، بضد ہیں کہ آپ دونوں ہنی مون پر جائیں جیسے آپ مجھے لے کر گئے تھے، اس کے لیے انہوں نے یہاں تک آفر دی ہے کہ اگر رقم کم پڑے تو وہ اَور دینے کو تیار ہیں ان کی پچھلے دنوں ہی دس لاکھ کی کمیٹی نکلی ہے۔ میں کافی دیر تک یہ سوچتا رہا آخر وہ کون سے گھرانے ہوتے ہیں جہاں دوسری اور تیسری شادی پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کو دیکھتا ہوں تو جنت لگتا ہے۔ آج صبح بیگم نے ناشتہ حجرہ عروسی میں پیش کیا اور اپنی ساتھی کو (سوتن لکھنے میں مجھے کوفت ہو رہی ہے) اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا کر کھلائے، اور چھیڑنے کے انداز سے کن انکھیوں سے بھی ہم دونوں کو دیکھتی رہیں، رات زبردستی گیارہ بجے ہم دونوں کو کمرے میں دھکیل کر بچوں کو شور شرابے سے روک کر کمرہ بند کر دیا، شکریہ بیگم ایسی بیویاں قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ کل رات شاید ہم ہنی مون پر مری نکل جائیں، تیسری بیوی ایک دن بعد ہی کہہ رہی ہے کہ چوتھی مَیں آپ کے لیے خود تلاش کروں گی، مجھ پر تو جیسے حیاء کی ایک سرخی سی آ گئی اور میں شرما سا گیا، عجیب شرمیلی طبعیت پائی ہے میں نے۔ بس سب دوست صبر اور دعاؤں سے کام لیتے ہوئے خاکسار کو بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(دیوانے کے خواب'' نامی ناول سے اقتباس)

اپنی خوراک بدلیں

وسعت اللہ خان

گوگل کا CEO بھارتی (سندر پیچائی) مائیکروسافٹ کا CEO بھارتی (ستیا ناڈیلا) اڈوب کا CEO بھارتی (شانتو نرائن) کوگزنیٹ کا سی ای او، فرانسیسیو ڈی سوزا نوکیا کا سی ای او، راجیو سوری گلوبل فاونڈیز کا سی ای او، سنجے کمار۔ ہرمین انٹرنیشنل کا سی او، دنیش پالی وال۔ نیٹ ایپ کا سی ای او، جورج کورین۔ پیپسی کولا کی سی ای او، اندرا نوئے۔ ماسٹر کارڈ کا سی ای او، اجے بانگا۔ ڈی بی ایس کا سی ای او، پائیش گپتا ریکٹ بینکیزر کا سی ای او، راکیش کپور۔ سی ای او کسی بھی کمپنی کا سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ کئی ہندو لوگ نائب سی ای او اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن ہمارے 22 کروڑ کے ہجوم کو ان باتوں سے کیا دلچسپی ایک کھوتا خور قوم کا جدید علوم سے کیا واسطہ؟؟؟ جس کی فی کس قیمت پانچ دس یا بیس ہزار روپے یا صرف ایک قیمے والے نان ہوگی۔ وہ نہ صرف آلو یا چاند پر اللہ اور محمد کا نام ڈھونڈے گی بلکہ اس پیغام کو دس لوگوں سے شیئر کرنے پر آپکو جنت کی نوید بھی سنا دے گی۔ میاں نواز شریف کا دوسرا دور حکومت تھا ہمارے ملک کے ایک بڑے بزنس مین کے بیٹے کو امریکہ میں معلوم ہوا کہ مائیکروسافٹ کے مالک بل گیٹس پینتیس ملین ڈالر کی لاگت سے کسی ایشیائی ملک میں مائیکروسافٹ یونیورسٹی ایڈوانس ٹیکنالوجی لیب بنانا چاہتے ہیں اور ان کا نظر انتخاب پاکستان ہے مگر امریکہ میں موجود بھارتی لابی اس پروگرام کو بھارت لے جا رہی ہے تو اس نوجوان نے وطن کی محبت میں متحرک ہونے کا فیصلہ کیا اور مائکروسافٹ کے ایشائی ٹیم کے لیڈر سے بات کی کہ یہ منصوبہ پاکستان کو ہی ملنا چاہیے اس پر ٹیم لیڈر نے کہا کہ پاکستان میں چونکہ نقل سازی عام ہے اور پائیریسی کے متعلق کوئی موثر قانون سازی بھی نہیں کی گئی لہٰذا اگر پاکستان تحریری ضمانت دے کہ پائیریسی کے حوالے سے قانون سازی کی جائے گی تو ہم یہ یونیورسٹی پروگرام پاکستان میں لانچ کر سکتے ہیں نوجوان خوشی خوشی ایک مہینے کا ٹائم لے کر پاکستان چلا آیا کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ مگر نوجوان جب پاکستان پہنچ کر حکومتی دروازوں پر پہنچا تو معلوم پڑا کہ اپنے وزیراعظم کے پاس ملاقات کا وقت نہیں ہے وزیروں کے پاس بھی فرصت نہیں تھی کہ ایک غیر ملکی

کوتحریری ضمانت دیتے پھریں۔ بیوروکریسی کوتو ویسے ہی ملکی مفاد کے منصوبوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں تو بڑے صاحب کے باتھ روم کی تزین وآرائش اور لاہور والے گھر جیسا شاور ڈھونڈنے کی ٹینشن تھی۔ خیر ہفتہ دس دن کی دوڑ دھوپ کے بعد یہ نوجوان وفاقی وزیر ہمایوں اختر سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔ تمام معاملہ سن کر ہمایوں اختر نے کہا کہ وفاقی وزیر احسن اقبال سے ملو اس پروجیکٹ کی متعلقہ وزارت کا قلمدان احسن اقبال کے پاس ہے۔ مزید کچھ دن خوار ہونے کے بعد احسن اقبال سے ملاقات ممکن ہوئی۔ نوجوان نے بصد ادب تمام معاملہ گوش گزار کیا جسے سن کر وزیر صاحب موصوف نے فرمایا اگر بل گیٹس مجھے خط لکھے تو پھر یہ گارنٹی دی جاسکتی ہے۔ اب بندہ پوچھے کہ دنیا کا امیر ترین بندہ اگر پاکستان جیسے غریب ملک کو مفت میں ایک انتہائی اہم یونیورسٹی دینا چاہتا ہے درخواست کرنے کی پوزیشن میں آپ ہیں یا وہ؟ اس کو کیا پڑی ہے کہ وہ خط لکھ کر قانون سازی کے متعلق درخواستیں کرے یہ اس کا کام ہے یا آپ کا؟ مگر وزیر صاحب نے نخوت بھرے لہجے میں یہ کہہ کر بات ہی ختم کردی کہ ہمیں سکھانے کی بجائے وہ کرو جو کہا گیا ہے۔ بے عزتی کرانے کے باوجود نوجوان چین سے نہ بیٹھا کیونکہ وہ اس منصوبے کی اہمیت سے آگاہ تھا۔ مزید کچھ دن خوار ہونے کے بعد اسے ایک خط دیا گیا جس میں ایک ڈرائیکٹر صاحب نے بل گیٹس کو حکم دیا ہوا تھا کہ جونہی یہ خط ملے تو فوراً حاضر ہو جائیں تاکہ آپ کی درخواست پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ اب نوجوان کی ہمت جواب دے گئی یہ خط آج بھی اس نوجوان کے پاس موجود ہے ذرا سوچیں اگر یہ خط بل گیٹس کو دے دیا جاتا تو وہ ہمارے متعلق کیا سوچتا۔

نوجوان تو تھک ہار کر بیٹھ گیا مگر انڈین لابی متواتر کوششوں میں لگی رہی اور جب انہیں معلوم پڑا کہ اب لوہا گرم ہے تو اپنے بھارتی وزیراعظم سے بل گیٹس کو فون کروادیا جس نے نہ صرف ہر قسم کی ضمانت دینے کا وعدہ کیا بلکہ بل گیٹس کو بھارت آکر خود اس کا افتتاح کرنے کی دعوت بھی دے ڈالی پھر دو ماہ بعد بل گیٹس نے بھارت جاکر نہ صرف یہ پروگرام لانچ کیا بلکہ سافٹ ویئر کی تعلیم کے لئے سو ملین ڈالر سالانہ دینے کا بھی اعلان کیا۔ بھارتیوں کے دن پھرے صرف دس سال کے قلیل عرصے میں ساڑھے دس لاکھ بھارتی نہ صرف امریکہ میں تعلیم حاصل کررہے تھے بلکہ اکیلے بھارتی شہر بنگلورو کی سالانہ آئی ٹی ایکسپورٹ اسی ہزار کروڑ ہوگئی۔ امریکیوں کے بعد سب سے زیادہ گوگل استعمال کرنے والے ہندوستانی آج مائیکروسوفٹ اور دیگر بڑی آئی ٹی کمپنیوں میں سی ای او سمیت دوسرے کلیدی عہدوں پر براجمان ہیں اور ان کمپنیز کے لیے بھارتیوں کو جاب دینا مجبوری بن چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے بھارتیوں کو جاب نہ دی تو ایک سال میں بھارتی ماہرین ہم سے بھی بڑی آئی ٹی کمپنیز کھڑی کردیں گے۔ اب بھی اگر آپ سمجھتے ہیں کہ نواز شریف اور ان کی تجربہ کار ٹیم پاکستان کو ترقی کی راہ پر ڈال سکتے ہیں تو یہ صرف آپ کی خوش فہمی ہی ہے۔ (اپنی خوراک تبدیل کیجیے)

جن کا بھٹو ابھی تک زندہ ہے ان کی بھی سن لیجیے

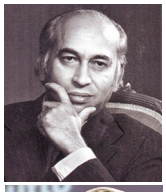

بلاول بھٹو زرداری میڈیکل کالج جامشورو

بختاور بھٹو کیڈٹ کالج نواب شاہ۔

بے نظیر بھٹو شہید یونیورسٹی بینظیر آباد

بے نظیر بھٹو ڈسٹرکٹ سکول، بینظیر آباد

بینظیر بھٹو یونیورسٹی اپر دیر۔

شہید بے نظیر بھٹو وومن یونیورسٹی پشاور میں ہے۔

شہید بے نظیر بھٹو میڈیکل یونیورسٹی لاڑکانہ۔

شہید بے نظیر گرلز کالج لاڑکانہ۔

بے نظیر بھٹو ڈگری کالج کراچی۔ شہید بے نظیر بھٹو سٹی یونیورسٹی کراچی۔

شہید بے نظیر بھٹو دیوان یونیورسٹی کراچی

شہید بینظیر ویٹنری اینڈ اینیمل سائنس یونیورسٹی کراچی۔

راولپنڈی جنرل ہسپتال کا نیا نام بے نظیر بھٹو ہسپتال ہے۔

شہید بے نظیر بھٹو میڈیکل کالج لیاری کراچی۔

بے نظیر بھٹو شہید اے این ایف ہسپتال کراچی۔

بے نظیر بھٹو شہید ہیں اور قابل احترام ہیں لیکن کیا اس ملک میں وہی واحد شہید ہیں اور واحد قابل احترام؟ کبھی حساب لگا لیجیے اس ملک میں قائداعظم، اقبال اور مادر ملت کے نام سے کتنے ادارے ہیں اور شریفوں اور بھٹوؤں کے نام سے کتنے ادارے ہیں؟ یہ ملک ایک امانت ہے یا ان دو خاندانوں کی چراگاہ؟ ہم مہذب دنیا کی ریاست کے باشندے ہیں یا ان دو خاندانوں کی جاگیر کے مویشی؟ انہیں اپنے قائدین سے اتنی ہی محبت ہے تو قومی خزانے کے ساتھ واردات کرنے کی بجائے اپنی جیب سے ان کے نام سے ادارے کیوں نہیں بناتے؟ انہیں یہ غلط فہمی کب سے ہوگئی کہ ہم انہیں مال غنیمت میں ملے ہیں، یہ سوچنا ہوگا لازم ہے۔

کراچی اور کراچی والے

الطاف شکور

اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں تو پتہ چلتا ہے کہ 1729ء میں کراچی کی حیثیت ''کولاچی'' نامی ایک گاؤں کی تھی۔ 1772ء میں چھوٹے سے گاؤں'' کولاچی'' کو مسقط اور بحرین سے تجارت کرنے کی بندرگاہ کے طور پر منتخب کیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ تجارتی مرکز میں تبدیل ہونا شروع ہوگیا تھا۔ 1775ء تک کراچی خان آف قلات کی مملکت کا حصہ تھا۔ اسی سال سندھ کے حکمرانوں اور خان آف قلات کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور کراچی پر سندھ کی حکومت کا قبضہ ہوگیا جس کے بعد کراچی سندھ کا حصہ بن گیا ہے۔ علاقہ کی واحد بندرگاہ ہونے کی وجہ سے اسے بہت تیزی کے ساتھ ترقی اور کامیابی ملتی چلی گئی اور اس کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ اس تیز رفتار ترقی نے جہاں ایک طرف خطہ کے کئی طبقہ کے لوگوں کو کراچی کی طرف کھینچا بلکہ انگریزوں کی نگاہیں بھی اس شہر کی طرف اُٹھ گئیں۔ 3/فروری 1839ء میں انگریزوں نے کراچی پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا اور تین سال کے بعد کراچی کو برطانوی ہندوستان کے ساتھ ملحق کر کے ایک ضلع کی حیثیت دے دی۔ 1876ء میں بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی کراچی میں پیدائش ہوئی۔ اس وقت کراچی ایک ترقی یافتہ شہر کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کا انحصار شہر کے ریلوے اسٹیشن اور بندرگاہ پر تھا۔ انگریزوں نے اس شہر کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے 1880ء کی دہائی میں ریلوے کے ذریعے کراچی کو باقی ہندوستان سے جوڑ دیا۔ 1889ء تک کراچی مشرقی دنیا کا سب سے بڑا گندم کی درآمد کا مرکز تھا۔ ابتداء میں جدید پبلک ٹرانسپورٹ کے طور پر کراچی میں ٹرامیں متعارف کرائی گئیں۔ جوکہ 1970ء کی دہائی تک کراچی کے شہریوں کی پبلک ٹرانسپورٹ کی ضروریات کو پورا کرتی رہی تھیں۔ انگریزوں نے نالوں اور نالیوں کے ذریعے شہر کا بہترین سیوریج سسٹم بنایا جو اب تک کارآمد ہے۔

1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔ اس وقت شہر کی آبادی صرف چار لاکھ تھی۔ پاکستان کا دارالحکومت بننے، قدرتی بندرگاہ اور تجارتی مراکز ہونے کی وجہ سے اس نے برق رفتاری سے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ جس وجہ سے ملک بھر سے روزگار کے لئے کراچی کی طرف تیزی سے ہجرت کا عمل شروع ہوا جس سے کراچی کی آبادی لاکھوں کے اعداد کو عبور کر کے کروڑوں میں ہو چکی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت کراچی میں اردو، سندھی، بلوچی، پشتو، پنجابی، گجراتی، میمنی، بنگالی، برمی، فارسی ودیگر زبانیں بولنے والے ڈھائی کروڑ سے زائد افراد آباد ہیں۔ انگریزوں نے کراچی کے قدرتی محل وقوع سے ایک طرف تجارتی طور پر بھرپور فائدہ اُٹھایا تو دوسری طرف شہر کو بے مثال ترقی دے کر اس کا حق بھی ادا کیا مگر آزادی کے بعد حکمرانوں نے کراچی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جس کے اثرات پاکستان کی مجموعی معیشت پر انتہائی منفی طور پر ظاہر ہونا شروع ہوئے ہیں۔ پاکستان کا سب سے مظلوم شہر کراچی ہے۔ کراچی پوری تین دہائیوں تک محصور رہا ہے اور کراچی والے محصور رہے ہیں۔ جو حکمران آیا اس نے کراچی اور کراچی والوں کو سونے کی چڑیا سمجھ لیا۔ ملک کی کل آمدنی کا 70 فیصد کراچی سے وصول کرنے کے باوجود اس تناسب سے ترقیاتی کام نہیں کرائے گئے۔ 1968ء میں دارالحکومت اسلام آباد منتقل ہونے کے بعد کراچی مسائل کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ 90-1980 نئی اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اور دوسری دہائی کی ابتداء میں کراچی تشدد، سیاسی، اور سماجی ہنگامہ آرائی اور دہشت گردی کا شکار رہا۔ گذشتہ دس سالوں میں پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت اور اس کے اتحادیوں نے کراچی کو بدحال کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کراچی کچرے کا ڈھیر بن چکا ہے۔ شہری پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہیں۔ سرکلر ریلوے اور بسوں پر مبنی پبلک ٹرانسپورٹ سسٹم کا ڈھانچہ مکمل طور پر تباہ کیا جا چکا ہے۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم اور اسپتالوں میں ادویات اور علاج میسر نہیں۔ ایسے حالات میں کراچی کے مسائل کے حل کے لئے اس کو آئینی حیثیت میں میگا سٹی کا درجہ دلانا ناگزیر ہو چکا ہے۔ کراچی کے مسائل ایک دن کی پیداوار نہیں ہیں۔ الیکشن کا موسم آتے ہی سیاسی جماعتوں کے دل میں کراچی کا درد اُٹھنا شروع ہوگیا ہے۔ تینوں بڑی سیاسی جماعت کے قائدین کراچی سے الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں مگر کراچی کے لوگوں کو اب یہ بات سمجھ آ گئی ہے کہ لندن، دبئی، لاڑکانہ، نواب شاہ یا دادو میں بیٹھ کر کراچی کو کنٹرول نہیں کیا جا سکتا ہے۔ 2003ء سے مسلسل چوتھے عام انتخابات کے ماحول نے عوام کے اندر اتنا سیاسی شعور پیدا کر دی اہے کہ وہ 2018ء کے عام انتخابات کے امیدواروں سے پچھلے انتخابات کا حساب مانگ رہے ہیں۔ 1972ء سے اب تک کراچی کے مسائل سے نظریں چرانے والوں کو آج کراچی کے مسائل یاد آ گئے ہیں۔ جن سیاسی جماعتوں کے میئر تین تین مدتیں

پوری کر چکے ہیں آج ان کے منہ پر میگا سٹی کا نعرہ کیسے آ گیا۔

''کراچی میگا سٹی'' کراچی کے نوجوانوں کا حقیقی خواب ہے ۔ پیشہ وارانہ سیاسی بھکاری ووٹروں کو بے وقوف بنانے کے لئے میگا سٹی کے نعرے کا غلط استعمال کر رہے ہیں مگر ووٹرز پہلے سے ہی جانتے ہیں کہ ان سیاسی جماعتوں کو کراچی کے لوگوں نے ایک نہیں کئی مرتبہ مینڈیٹ دیا مگر انہوں نے کراچی کی کوئی خدمت نہیں کی ۔انہوں نے صرف میگا بدعنوانیوں، لاقانونیت ، اور بدانتظامی کے ذریعہ اپنے آقاؤں کے مفادات کی دیکھ بھال کی ہے۔ سیاسی جماعتیں 1972ء میں سے کراچی کے ووٹروں کو بے وقوف بنا رہی ہیں اور اب ایک مرتبہ پھر یہ لوگ مگر مچھ کے آنسو بہا رہے ہیں ۔مگر الحمدللہ اب عوام میں سیاسی شعور نظر آ رہا ہے ۔لوگ پانچ سال تک گدھے کے سینگ کی طرح غائب رہنے والے اراکین صوبائی وقومی اسمبلیوں کا گھیراؤ کر رہے ہیں ۔ کراچی'' میگا سٹی'' کی آئینی حیثیت مل جائے تو عوام کے مسائل مستقل بنیادوں پر حل ہوں گے۔

***

عامرؔ حسنی

تری خوش خرامی ہے دل میں بسی ہاں
چلے آئیں آنسو لدے جائیں مژگاں
محبت ہے تم سے خدا جانتا ہے
اُدھورا ہے جیون بِنا آپ کے ہاں
نہ ڈھب سے نبھائی گئی رَسمِ دُنیا
محبت بھرا دل فرشتے گواہاں
ستم گر زمانے سے ناآشنا تھے
جو ڈوبے تو ڈوبے شناور نہیں ہاں
رہے اپنی تر دامنی سے شناسا
محبت کے قابل نہیں ہم نہیں ہاں
یہ دنیا خرابات سے گو لبالب
مری جاں نہیں کوئی تم سا نہیں ہاں
جو عامرؔ کے دل میں بسا حشر ساماں
رُخِ ماہتابی مرا ہے مرا ہاں

جبران ناصر فرنود عالم

جبران ناصر جیتے گا یا نہیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ بات تو پکی ہے کہ جوان ہارے گا نہیں۔ پاکستان ایسے دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں جیتنے والے اور نہ ہارنے والے دوبدو ہو گئے ہیں۔ جیتنے والے وہ ہیں جو عوام کا فیصلہ نہیں مانتے۔ نہ ہارنے والے وہ ہیں جو عوام کے فیصلے کو مسترد کرنے کا فیصلہ نہیں مانتے۔ جنہیں عوام کا فیصلہ قبول نہیں، وہ جبر کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ جو جبر کے فیصلے نہیں مانتے وہ خلق خدا کی آواز کو پتھر کی لکیر جانتے ہیں۔ دونوں میں کیا مقابلہ اور کیا موازنہ جبران ناصر کہتا ہے میں تبلیغ پہ نہیں نکلا ہوا۔ صاف جھوٹ! ظالم تبلیغ کر رہا ہے اور مست تبلیغ کر رہا ہے۔ جبران کی آواز فرسودہ کاروبارِ سیاست میں تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ یہ آواز شہریوں کے بیچ جنس رنگ نسل اور عقیدے کی بنیاد پر تفریق سے انکار کی آواز ہے۔ اس آواز کے ساتھ قومی اسمبلی میں جگہ بنانا ممکن نہیں ہے۔ اس آواز کی سزا مشال خان کے والد اقبال لالا سے کوئی پوچھے۔ ایک برس میں صدیوں کی مسافت اس بزرگ نے طے کر لی ہے۔ کہنا اچھا نہیں لگتا، مگر مملکت کے منہ کو خون لگ چکا ہے۔ سنگ وخشت یہاں مقید ہیں اور سگ آزاد پھر رہے ہیں۔ صرف پنجاب میں ہی سترہ ہزار مسلم لیگی سیاسی کارکنوں پر مقدمات قائم کیے چکے ہیں اور دوسری جماعتوں کے اس کے علاوہ ہیں۔ یہی سلسلہ ہفتہ بھر سے کراچی میں جاری ہے۔ دوسری طرف دوسو مذہبی انتہا پسندوں کے نام فورتھ شیڈول سے نکال کر معزز شہریوں پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اب جس سمت میں ترقی پسند نمائندے کھڑے ہیں وہاں بارود کی بو پھیلی ہے۔ جس طرف نفرت کے سوداگر کھڑے ہیں مملکت نے وہاں پلکیں بچھائی ہوئی ہیں۔ جبران نے اس نگر میں آواز لگائی ہے جہاں منجھے ہوئے انتخابی امیدوار کے کاغذات مکمل ہوں تو دعائے قنوت سن لی جاتی ہے۔ جہاں تعلیمی نصاب مذاہب کا تعارف نہیں کرواتا بلکہ مذاہب کے حوالے سے اپنی رائے دیتا ہے۔ جہاں منافرت، فرقہ واریت اور جبر کو آئینی وقانونی حیثیت حاصل ہے۔ آپ انڈیا کے جھنڈے پر کھڑے ہو کر تصویر بنوالیں تو آپ اغوا برائے تاوان، چوری چکاری اور قتل وغارت گری کی سند رکھتے ہیں۔ آپ نے مملکت کا بالادست عقیدہ اختیار کر لیا ہے تو جنگل

ترے پربت ترے بستی تری صحرا ترا۔ اشرافیہ نے مذہب کی خیمہ بستیوں میں حب الوطنی کے کمبل اوڑھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں دو باتیں تعلیم کر رکھی ہیں۔ علم و اخلاق پر عقیدے کا اجارہ ہوتا ہے اور یہ کہ مذہبی عقیدے کو سیاسی موقف پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے بھی ستر برس قبل یہ سبق یاد کر لیا، وہ دن ہے آج کا دن ہے ہمیں چھٹی نہ ملی۔ ہم نے ہمیشہ بلند کرداری پر خوش عقیدگی کو ترجیح دی ہے۔ جنہوں نے ہماری پگ خلیج بنگال میں پھینکی وہ خوش عقیدہ ہونے کی وجہ سے سبز ہلالی پرچم میں کفنائے گئے۔ جنہوں نے سرحدوں پر اپنے خون سے لکیر کھینچی وہ بدعقیدہ ہونے کی وجہ سے بھولی بسری داستان ہو گئے۔ اس بیچ سماج کو قصوروار کیوں ٹھہرا جائے؟ قصوروار تو وہ طبقہ اشراف ہے جس نے بہت محنت سے یہ پڑھایا ہے کہ کافر ہزار نیکیاں کر لے، بدطینت مومن پر پھر بھی فضیلت نہیں پا سکتا۔ عبدالستار ایدھی عظمت کا مینار ہوں گے، مگر حورانِ بہشت کو تو مولانا عبدالعزیز سے مطلب ہے۔ دیا ہوگا ڈاکٹر عبدالسلام نے بھی کوئی کارنامہ سرانجام، مگر قومی ہیرو بننے کی اہلیت تو سراج رئیسانی میں ہے۔

جبران کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ یہ نشست وہ جیت جائے گا۔ اس بات کا مگر اسے یقین ہے کہ اس کی آواز امر ہو جائے گی۔ وہ خود کو سوالات کی زد پر رکھ کر ووٹروں کو کچھ موٹی موٹی باتیں سمجھا رہا ہے۔ جیسے کہ جوتوں سمیت کسی شہری کی آنکھ میں اترنا بداخلاقی ہوتی ہے۔ اور یہ کہ امیدوار کے سیاسی نقطہ نظر کی بجائے اس کے مذہبی عقیدے میں دلچسپی لینا نری فحاشی ہوتی ہے۔ سوچنا چاہیے کہ جو قوم ووٹر لسٹ پر مذہب کے اندراج پر اصرار کرتی ہے، وہ قوم اپنی سی وی میں عقیدے کا حوالہ کیوں نہیں دیتی؟

کسی امیدوار سے اس کے عقیدے کا پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کمپنی عقیدے کے اندراج کے بغیر آپ کی سی وی قبول کرنے سے انکار کر دے۔ آپ کے کوائف مکمل ہوں مگر کمپنی آپ کو اس لیے مسترد کر دے کہ آپ کا عقیدہ ان کی رائے میں درست نہیں ہے، تو کیسا محسوس ہوگا؟ برا لگے اور لگنا بھی چاہیے۔ کیونکہ عقیدہ اہلیت یا صلاحیت نہیں ہوتا۔ عقیدہ کتنا ہی درست ہو آپ ہمالیہ سر نہیں کر سکتے۔ دل میں ایمان نہیں، اس کے لیے ہڈی میں گودا درکار ہوتا ہے۔ دنیا نے اگر چاند پر بستر لگا لیا ہے تو اس میں عقیدے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم زمین پر بھی اگر ڈھنگ سے چل نہیں پا رہے تو عقیدے اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ جسٹس منیر، جسٹس مولوی مشتاق، جسٹس ڈوگر اور جسٹس افتخار اگر انصاف نہ کر سکے تو اسلام کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ رانا بھگوان داس نے انصاف کا بول بولا کیا تھا تو ہندومت کا اس میں کوئی کمال نہیں ہے۔

جبران ناصر کی کوئی دینی نسبت نہیں ہے۔ مذہبی نعرہ لے کر وہ معرکے میں نہیں اترا بلکہ اس بات پر وہ ایمان رکھتا ہے کہ سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال ملاوٹ کی بدترین صورت ہے۔ پھر بھی حرم کے پاسبان محدب عدسے لیے چڑھ چڑھ کے آتے ہیں اور جبران کے دانت چیک کرتے ہیں۔ یہ وقت دراصل امیدوار کے حوصلے کے امتحان کا وقت ہے۔ جو اس نے کہا اس پر قائم ہے، یا پھر اس عقیدے کو فوراً ظاہر کر کے ووٹ پکے کروانا چاہتا ہے جو مملکت کے بالادست عقیدے کے لیے قابل قبول ہو۔

جبران سے کل کسی نے پوچھا، احمدیوں کے حوالے سے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے۔ ارے نہیں، یہ پوچھا ہوتا تو کیا ہی بات تھی۔ کہنے والے نے کہا کہ آپ احمدیوں کو کافر قرار دیجیے پھر اگلی بات ہوگی۔ بھرے بازار میں قدسیوں کے بیچ ہاہا کار مچی رہی، مگر جبران نے اپنی رائے نہیں دی۔ جبران اگر رائے دے دیتا تو وہیں ہار جاتا۔ اپنی رائے نہ دے کر اس نے وہ جیت اپنے نام کر لی ہے جس کا اعلان برسوں بعد تب ہوگا جب ووٹروں کی اکثریت کو احساس ہو جائے گا کہ کسی کے عقیدے پر رائے دینا کسی شہری کا منصب نہیں ہے۔ اور ریاست کا تو بالکل بھی نہیں! انتخابی امیدوار الیکشن لڑ رہے ہیں، جبران ناصر جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ جنگ محض اس بات کی جنگ نہیں کہ جو اختیارات پارلیمان سے چھینے جا چکے ہیں، وہ واپس کر دیے جائیں۔ یہ اس بات کی بھی جنگ ہے کہ جو اختیارات خدا سے لیے جا چکے ہیں، وہ اسے لوٹا دیے جائیں۔

***

خوبصورت پڑوسن اور نیلا دوپٹہ

نئی خوبصورت، طرحدار اور جواں سال پڑوسن محلے میں آباد ہوئی تھی۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ شوہر شکل ہی سے خرانٹ اور بدمزاج لگتا تھا۔ پڑوسن کی صورت دیکھ کر ہی محلے کے مردوں کی تمام تر ہمدردیاں خاتون کے ساتھ ہوگئیں۔ خاتون نے آہستہ آہستہ محلے کے گھروں میں آنا جانا شروع کیا۔ شیخ صاحب اور مرزا صاحب کو اپنی اپنی بیگمات کے توسط سے پتا چلا کہ نئی پڑوسن کا شوہر تند خو اور شکی ہے۔ خاتون شوہر سے کافی ڈرتی ہیں۔ یہ سنتے ہی دونوں مرد حضرات کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ دل ہی دل میں شکوہ کرلیا کہ یا اللہ کیسے کیسے ہیرے ناقدروں کو دے دیئے ہیں۔

ایک دن نئی خوبصورت پڑوسن سبزی والے کی دکان پر شیخ صاحب کو ملی۔ خود ہی آگے بڑھ کر سلام کیا۔ شیخ صاحب کو اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ خاتون نے کہا کہ شیخ صاحب برا نہ مانیں تو آپ سے کچھ مشورہ درکار ہے۔ شیخ صاحب خوشی سے باولے سے ہوگئے۔ خاتون نے عام گھریلو عورتوں کی طرح بھائی صاحب کہنے کے بجائے شیخ صاحب کہا تھا۔ شیخ صاحب نے دلی خوشی چھپاتے ہوئے نہایت متانت سے جواب دیا۔ جی فرمایئے۔ خاتون نے کہا میرے شوہر کام کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر رہتے ہیں۔ میں اتنی پڑھی لکھی نہیں۔ بچوں کے اسکول کے ایڈمیشن کی سلسلے میں رہنمائی درکار تھی۔

خاتون نے کہا کہ یوں سڑک پہ کھڑے ہوکر بات کرنا مناسب نہیں۔ کیا آپ کے پاس وقت ہوگا تو چند منٹ مجھے سمجھا دیں تاکہ میں کل ہی ان کا داخلہ کروا دوں۔ شیخ صاحب چند منٹ کیا صدیاں بتانے کو تیار تھے۔ فورا کہا جی ضرور۔ آیئے۔ شیخ صاحب خاتون کے ہمراہ چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ابھی صوفے پر بیٹھے ہی تھے کہ باہر اسکوٹر کے رکنے کی آواز آئی۔ خاتون گھبرا گئی۔ یا اللہ میرے شوہر آگئے۔ انہوں نے تو میرا اور آپ کا قتل ہی کر دینا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سنیں گے۔ ایک کام کیجیے۔ یہ سامنے کپڑوں کا ڈھیر ہے۔ آپ یہ نیلا دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جائیں اور کپڑے استری کرنا شروع کردیں۔ میں کہہ دوں گی کہ استری والی ماسی کام کررہی ہے۔

شیخ صاحب نے جلدی سے گھونگھٹ کاڑھا اور استری کرنے لگے۔ تین گھنٹے تک استری کرتے رہے جب تک وہ خرانٹ شخص گھر میں موجود رہا۔ جیسے ہی شوہر گھر سے باہر گیا۔ پسینے میں شرابور، تھکن سے چور شیخ صاحب نڈھال قدموں سے گھر سے نکلے۔ جیسے ہی باہر نکلے سامنے مرزا صاحب آتے دکھائی دیئے۔ پوچھا کتنی دیر سے اندر ہو۔ بولے تین گھنٹوں سے استری کررہا ہوں۔ مرزا صاحب نے تاسف سے دیکھا اور بولے۔ جس کپڑوں کے ڈھیر کو تم نے تین گھنٹے استری کیا ہے، کل میں نے ہی چار گھنٹے بیٹھ کر دھوئے ہیں۔ کیا تمہیں بھی نیلا دوپٹہ اڑھایا تھا؟؟؟ شیخ صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں دوست مرے مرے قدموں سے اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

تحریر: عاشور بابا...

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب عوامی نیشنل پارٹی کے راہنماؤں کو پاکستان میں حراست میں لیا گیا تو ایک ایسا شخص تھا جو بہت ہی خستہ حال تھا، اس کو گرفتار کر کے حیدرآباد جیل لایا گیا۔ جیلر نے اس پریشان حال شخص کو دیکھا اور حقارت سے کہا کہ اگر تم عبدالولی خان کے خلاف بیان لکھ کر دے دو تو ہم تم کو رہا کر دیں گے۔ ورنہ یاد رکھو اس کیس میں تم ساری عمر جیل میں گلتے سڑتے رہو گے اور یہیں تمہاری موت ہوگی۔ یہ سن کر اس شخص نے جیلر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور مسکرا کر کہا جیلر صاحب جیل میں تو شاید میں چند برس زندہ بھی رہ لوں لیکن اگر میں نے یہ معافی نامہ لکھ دیا تو شاید چند دن بھی نہ جی پاؤں اصولوں اور عزم و ہمت کی اس دیوار کا نام حبیب جالب تھا۔ اور اس کو جیل میں بھیجنے والا اپنے وقت کا سب سے بڑا لیڈر ذوالفقار علی بھٹو تھا۔ میں کل سے حیرت کا بت بنا بیٹھا ہوں جب میں نے بلاول بھٹو کو ذوالفقار علی بھٹو کی برسی پر حبیب جالب کا کلام پڑھتے دیکھا اور کلام بھی وہ جو اس نے بھٹو کے دور میں لکھا تھا۔ آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ حبیب جالب عوامی نیشنل پارٹی کے لیڈر تھے اور انہوں نے بھٹو دور میں الیکشن لڑا تھا اور الیکشن ہارنے کے بعد وہ بھٹو کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے، ان کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ضیاء الحق کے مارشل لاء کے بعد ان کو اس کیس سے بری کیا گیا تھا۔ کاش کہ بلاول کو تاریخ سے تھوڑی سی بھی آگہی ہوتی تو ان کو معلوم ہوتا ہے کہ عظیم انقلابی شاعر حبیب جالب کا بیشتر کلام بلاول کے نانا ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تھا۔ جن میں سے ایک مشہور نظم پیش خدمت ہے۔

میں پسرِ شاہنواز ہوں میں پدرِ بے نظیر ہوں
میں نکسن کا غلام ہوں، میں قائد عوام ہوں
میں شرابیوں کا پیر ہوں، میں لکھ پتی فقیر ہوں

وہسکی بھرا اک جام ہوں، میں قائد عوام ہوں
جتنے میرے وزیر ہیں، سارے بے ضمیر ہیں
میں انکا بھی امام ہوں، میں قائد عوام ہوں
دیکھو میرے اعمال کو، میں کھا گیا بنگال کو
پھر بھی میں نیک نام ہوں، میں قائد عوام ہوں

کل جب بھٹو کی برسی پر بلاول حبیب جالب کا کلام پڑھ رہے تھے تو بھٹو دور میں ہونے والے مظالم میری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔حبیب جالب پر اتنا ظلم ایوب خان اور ضیاء الحق جیسے آمروں کے دور میں نہیں ہوا جتنا ظلم قائد عوام اور ایک جمہوری لیڈر بھٹو کے دور میں ہوا۔جس دن بھٹو نے حبیب جالب کو گرفتار کروایا تھا اس دن جالب کے بیٹے کا سوئم تھا اور وہ چاک گریبان کے ساتھ جیل میں گئے تھے اور اپنے بیٹے کی یاد میں لکھی نظم ایک تاریخی انقلابی نظم ہے کاش کوئی یہ سب باتیں جا کر بلاول کو بتائے کہ رٹی رٹائی تقریریں کر لینا بہت آسان ہے لیکن بہتر ہوا گر تم ان باتوں کا تاریخی پسِ منظر بھی جان لو۔جیسی جاہل یہ قوم ہے ویسے ہی جاہل اور تاریخی حقائق سے نابلد ان کے لیڈر...!!

فہمیدہ مسرت احمد

زیست کا گُل نصاب ہیں آنکھیں
جیسے کوئی کتاب ہیں آنکھیں
گُلبدن وہ گلاب ہیں آنکھیں
دھڑکنوں کا رُباب ہیں آنکھیں
ان کے دَم سے ہے دلکشی ساری
حُسن کی آب و تاب ہیں آنکھیں
دیکھتے ہی خمار چھا جائے
ہائے ایسی شراب ہیں آنکھیں
درد لیتی ہیں درد دیتی ہیں
کتنی خانہ خراب ہیں آنکھیں
ایسے چھم چھم برستی رہتی ہیں
سچ کہوں تو سحاب ہیں آنکھیں
آنکھ بن عشق کا وجود کہاں
عشق کا انتساب ہیں آنکھیں

اطہر حفیظ فراز

سنا ہے لوگ نکلیں گے، سنا ہے دور بدلے گا،
سنا ہے قوم اُٹھے گی، سنا ہے طور بدلے گا،
وہی ٹولے، وہی نعرے، مگر اک شور بدلے گا،
تجوری پھر وہی ہو گی، فقط اک چور بدلے گا،
یہاں پر کس میں جرات ہے، جو حق کی بات کرتا ہے،
مگر اس بربریت کو تو کوئی اور بدلے گا
سنا ہے سانپ آئیں گے، سناہے پھر ندا ہو گی،
سنا دربار سجنے ہیں، سنا ہے پھر صدا ہو گی،
وہی ساحر، وہی رسے، وہی پھر اک خطاہو گی،
وہیں پھر اک عصا ہو گا، وہیں پھر اک ادا ہوگی،
یہاں جو ظلم بوئے ہیں انھیں اب کون بدلے گا ؟؟
وہی موسیٰ،وہی ایمن، فقط فرعون بدلے گا
وہی پھر بت گرہویں گے، وہ لوگوں کو بلائیں گے،
وہی پھر بادشاہ ہو گا، وہی لکڑی جلائیں گے،
انہی شعلوں پہ ابراھیم کو جب لے کے آئیں گے،
فرشتے آگ کو اپنی ہی پھونکوں سے بجھائیں گے،
نہ ہی وعدہ بدلنا ہے، نہ ہی موعود بدلے گا،
خلیل اللہ وہی ہوگا مگر نمرود بدلے گا
بدلنا ہے، سماں بدلو!! یہ سنگ آستاں بدلو!!
بدلنا ہے، نشاں بدلو، نہ کہ تیر و کماں بدلو!!
بدلنا ہے نظر بدلو!! نہ رنگ دو جہاں بدلو!!
ضمیروں کو جگا ڈالو!! یہ اپنا پاسباں بدلو!!
اس صورت میں ہرجانب کوئی ہریالی پاؤ گے،
نہیں تو مار کھاؤ گے، بظاہر جیت جاؤ گے
اگر ہر قوم و ملت کو نہیں آزاد رکھا تو!!
اسی فرقہ پرستی کو اگر بنیاد رکھا تو!!
اگر قائد کے فرماں کو نہیں جو یاد رکھا تو!!
جو دل میں بغض و نفرت کو فقط آباد رکھا تو!!
تو پھر یہ وحدت قومی کبھی نہ ہاتھ آئے گی،
جو نعمت تم نے پائی تھی، وہ تم سے چھینی جائے گی

فرانسس برنیئر کے وقت کا ہندوستان

یہ فرانس کا رہنے والا تھا۔ یہ 1658ء میں ہندوستان آیا اور 1670ء تک بارہ سال ہندوستان میں رہا۔ یہ شاہجہاں کے دور کے آخری دن تھے، برنیئر طبی ماہر تھا چنانچہ یہ مختلف اُمراء سے ہوتا ہوا شاہی خاندان تک پہنچ گیا، اسے مغل دربار، شاہی خاندان، حرم سرا اور مغل شہزادوں اور شہزادیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، برنیئر نے شاہجہاں کو اپنی نظروں کے سامنے بے اختیار ہوتے اور اپنے صاحبزادے اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھوں قید ہوتے دیکھا، اس نے اورنگ زیب عالمگیر کی اپنے تینوں بھائیوں داراشکوہ، سلطان شجاع اور مراد بخش سے جنگیں بھی دیکھیں اور بادشاہ کے ہاتھوں بھائیوں اور انکے خاندانوں کو قتل ہوتے بھی دیکھا۔ اس نے دارالشکوہ کو گرفتار ہو کر آگرہ آتے اور بھائی کے سامنے پیش ہوتے بھی دیکھا اور اسے اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ لاہور، بھمبر اور کشمیر کی سیاحت کا موقع بھی ملا، فرانسیس برنیئر نے واپس جا کر ہندوستان کے بارے میں سفرنامہ تحریر کیا، یہ سفرنامہ 1671ء میں پیرس میں شائع ہوا، یہ بعدازاں انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا، برطانیہ میں چھپا اور اسکے بعد آوٹ آف پرنٹ ہو گیا، مجھے چند دن قبل فرانسیس برنیئر کا یہ سفرنامہ پڑھنے کا موقع ملا، میں یہ کتاب پڑھ کر ورطہ حیرت میں چلا گیا کیونکہ فرانسیس برنیئر نے 1660ء میں جو ہندوستان (موجودہ پاکستان) دیکھا تھا وہ آج تک اسی اسپرٹ اور اسی کلچر کے ساتھ قائم ہے، ہم نے ساڑھے تین سو برسوں میں کچھ نہیں سیکھا۔ فرانسس برنیئر نے ہندوستان کے بارے میں جگہ جگہ حیرت کا اظہار کیا، اسکا کہنا تھا، ہندوستان میں درمیانہ طبقہ (مڈل کلاس) سرے سے موجود نہیں، ملک میں اُمراء ہیں یا پھر انتہائی غریب لوگ، اُمراء محلوں میں رہتے ہیں، انکے گھروں میں باغ بھی ہیں، فوارے بھی، سواریاں بھی اور درجن درجن نوکر چاکر بھی جبکہ غریب جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور انکے پاس ایک وقت کا کھانا تک نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے، ہندوستان میں خوشامد کا دور دورہ ہے، بادشاہ سلامت، وزراء، گورنرز اور سرکاری اہلکار دو دو گھنٹے خوشامد کراتے ہیں۔

دربار میں روزانہ سلام کا سلسلہ چلتا ہے اور گھنٹوں جاری رہتا ہے۔ لوگوں کو خوشامد کی اسقدر عادت پڑ چکی ہے کہ یہ میرے پاس علاج کے لیے آتے ہیں تو مجھے سقراط دوراں، بقراط اور ارسطو زمان اور آج کا بوعلی سینا قرار دیتے ہیں اور اسکے بعد نبض کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں، بادشاہ سلامت دربار میں جب بھی منہ کھولتے ہیں تو درباری کرامت کرامت کا ورد شروع کر دیتے ہیں، لوگ جیبوں میں عرضیاں لے کر گھومتے ہیں اور انھیں جہاں کوئی صاحب حیثیت شخص دکھائی دیتا ہے یہ اپنی عرضی اسکے سامنے رکھ دیتے ہیں اور وہ جبتک اس عرضی پر حکم جاری نہیں کرتا سائل وہاں سے ٹلنے کا نام نہیں لیتا. بازار بے ترتیب اور گندے ہیں آپکو ایک دکان سے پشمینہ، کمخواب، ریشم اور زری کا کپڑا ملے گا اور ساتھ کی دکان پر تیل، گھی، آٹا اور شکر بک رہی ہوگی۔

آپکو کتابوں اور جوتوں کی دکانیں بھی ساتھ ساتھ ملیں گی، ہر دکان کا اپنا نرخ ہوتا ہے۔ اور بھاؤ تاؤ کے دوران اکثر اوقات گاہک اور دکاندار ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں، شہروں میں حلوائیوں کی دکانوں کی بہتات ہے مگر آپکو دکانوں پر گندگی، مکھیاں، مچھر، بلیاں اور کتے دکھائی دیتے ہیں، آپکو ہندوستان بھر میں اچھا گوشت نہیں ملتا، قصائی بیمار اور قریب المرگ جانور ذبح کر دیتے ہیں۔ پھل بہت مہنگے ہیں، ہندوستان میں خربوزہ بہت پیدا ہوتا ہے لیکن دس خربوزوں میں سے ایک میٹھا نکلتا ہے۔ سردہ بہت مہنگا ہے، میں پونے چار روپے کا سردہ خریدتا ہوں، ملک میں شراب پر پابندی ہے لیکن چھپ کر سب پیتے ہیں، شراب شیراز سے اسمگل ہو کر آتی ہے۔ اور شہروں میں عام ملتی ہے تاہم حکومت نے عیسائیوں کو شراب پینے کی اجازت دے رکھی ہے۔ مگر یہ اکثر اوقات اپنی شراب مسلمانوں کو بیچ دیتے ہیں، ملک بھر میں جوتشیوں کی بھرمار ہے. یہ دریاں بچھا کر راستوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور لوگ انکے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں، ملک میں پینے کا صاف پانی نہیں ملتا چنانچہ امراء اونٹ پر پانی لاد کر سفر کے لیے نکلتے ہیں، ہندوستان کی مٹی زرخیز ہے لیکن زراعت کے طریقے قدیم اور فرسودہ ہیں چنانچہ کسان پوری پیداوار حاصل نہیں کر پاتے' ہندوستان کی زیادہ تر زمینیں بنجر پڑی ہیں، لوگ نہروں اور نالیوں کی مرمت نہیں کرتے' چھوٹے کسان یہ سمجھتے ہیں اس سے جاگیرداروں کو فائدہ ہوگا اور جاگیردار سوچتے ہیں بھل صفائی پر پیسے ہمارے لگیں گے مگر فائدہ چھوٹے کسان اٹھائیں گے۔ لہٰذا یوں پانی ضایع ہو جاتا ہے' لاہور کے مضافات میں ہر سال سیلاب آتا ہے اور سیکڑوں لوگوں کی ہزاروں املاک بہا لے جاتا ہے لیکن لوگ سیلابوں کی روک تھام کا کوئی بندوبست نہیں کرتے چنانچہ اگلے سال دوبارہ تباہی دیکھتے ہیں۔ فرانسیس برنیئر نے ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں لکھا یہ کاریگر ہیں لیکن کاریگری کو صنعت کا درجہ نہیں دے پاتے لہٰذا فن کار ہونے کے باوجود بھوکے مرتے ہیں، یہ فنکاری کو کارخانے کی شکل دے لیں تو خوشحال ہو جائیں اور

دوسرے لوگوں کی مالی ضروریات بھی پوری ہو جائیں، ہندوستان کے لوگ روپے کو کاروبار میں نہیں لگاتے، یہ رقم چھپا کر رکھتے ہیں، عوام زیورات کے خبط میں مبتلا ہیں، لوگ بھوکے مر جائیں گے لیکن اپنی عورتوں کو زیورات ضرور پہنائیں گے، ملک کا نصاب تعلیم انتہائی ناقص ہے، یہ بچوں کو صرف زبان سکھاتا ہے انکی اہلیت میں اضافہ نہیں کرتا، خود اورنگزیب نے میرے سامنے اعتراف کیا ''میں نے اپنے بچپن کا زیادہ تر وقت عربی زبان سیکھنے میں ضائع کر دیا'' یہ لوگ فاقوں کو بیماریوں کا علاج سمجھتے ہیں چنانچہ بخار میں فاقے شروع کر دیتے ہیں۔ ملک میں رشوت عام ہے، آپکو دستاویزات پر سرکاری مہر لگوانے کے لیے حکام کو رشوت دینا پڑتی ہے، صوبے داروں کے پاس وسیع اختیارات ہیں، یہ بیک وقت صوبے دار بھی ہوتے ہیں، خزانچی بھی، وکیل بھی، جج بھی، پارلیمنٹ بھی اور جیلر بھی۔ سرکاری اہلکار دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں، بادشاہ نے اپنے لیے 3 کروڑ 184 روپے کا (1660ء میں) تخت بنوایا۔ سرکاری عہدیدار پروٹوکول کے ساتھ گھروں سے نکلتے ہیں۔

یہ ہاتھیوں پر سوار ہو کر باہر آتے ہیں، انکے آگے سپاہی چلتے ہیں، ان سے آگے ماشکی راستے میں چھڑکاؤ کرتے ہیں، ملازموں کا پورا دستہ مورچھل اٹھا کر رئیس اعظم کو ہوا دیتا ہے اور ایک دو ملازم اگل دان اٹھا کر صاحب کے ساتھ چلتے ہیں. یہ لوگ گھر بہت فضول بناتے ہیں۔ انکے گھر گرمیوں میں گرمی اور حبس سے دوزخ بن جاتے ہیں اور سردیوں میں سردی سے برف کے غار، بادشاہ اور امراء سیر کے لیے نکلتے ہیں تو چھ چھ ہزار مزدور انکا سامان اٹھاتے ہیں، ہندوستان کی اشرافیہ طوائفوں کی بہت دلدادہ ہے۔

ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں طوائفوں کے کوٹھے ہیں اور امراء اپنی دولت کا بڑا حصہ ان پر نچھاور کر دیتے ہیں، طوائفیں شاہی خاندان کی تقریبات میں بھی بلوائی جاتی ہیں اور دربار سے وابستہ تمام لوگ انکا رقص دیکھتے ہیں، وزراء صبح اور شام دو مرتبہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں، بادشاہ کے حضور حاضری نہ دینے والے وزراء عہدے سے فارغ کر دیئے جاتے ہیں. ہندوستان میں گرد، غبار، گندگی، بو اور بے ترتیبی انتہا کو چھو رہی ہے اور جرائم عام ہیں، مجرم اول تو پکڑے نہیں جاتے اور اگر پکڑ لیے جائیں تو یہ سفارش یا رشوت کے ذریعے چھوٹ جاتے ہیں۔ یہ فرانسس برنیئر کے سفرنامے کے چند حقائق تھے، آپ انھیں دیکھئے اور آجکے پاکستان پر نظر دوڑایئے۔ آپکو یہ جان کر اطمینان ہوگا ہم نے ''الحمدللہ'' ساڑھے تین سو سال میں کچھ نہیں سیکھا۔

بھکاری

کسی شخص نے ایک بھکاری سے پوچھا کہ ''کیا تم نے بھیک مانگنے کے لئے بھی اصول بنا رکھے ہیں''۔ ''بالکل ہمارے اصول ہیں'' بھکاری نے بڑے فخریہ لہجے میں کہا ''ہر چیز مانگو، ہر وقت مانگو، ہر کسی سے مانگو''

زندگی

انسان زندگی کو اپنے تجربے کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ یہ سات رنگوں میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ زندگی خوابوں کا خوب صورت جزیرہ ہے۔ جبکہ کوئی اسے شکستہ خوابوں کا قبرستان کہتا ہے۔ کسی کی نظر میں یہ پھولوں کی سیج ہے۔ تو کسی کی نظر میں یہ کانٹوں کا بستر ہے کوئی اسے گل محبت اور کوئی اسے نفرت اور فراق کے کانٹے سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی اسے غم کا دریا کوئی خوشیوں کا جھرنا کہتا ہے۔ کسی کی نظر میں شبِ سیاہ اور کسی کی نظر میں شب برات ہے۔ کسی نظر میں آنسو اور کسی نظر میں دل آویز مسکراہٹ ہے۔ کوئی اسے نغمہ محبت اور کوئی اسے غم کا مرثیہ گردانتا ہے۔ مگر میری نظر میں یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پورے اعتماد کے ساتھ باعزت طریقے سے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے گزارنا چاہیئے۔

تلاشِ گُم شدہ

ہم سے ''خلوص'' گُم ہو گیا ہے۔ اُس کی عمر سو سال ہے بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو گیا ہے۔ گھر میں خودغرضی کا ماحول اور اَن بَن ہونے کی وجہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا ہے شنید ہے کہ ہمدردی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ ابھی تک دونوں کی خبر نہیں۔ اُس کے بھائی ''اُخوت اور بہن حُبا لوطنی'' اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ اُس کا بھائی اُخوت بہت ہی پریشان ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس کی بہن شرافت کا انتقال ہو گیا ہے۔ شرافت کے غم میں حیا بھی بستر مرگ پر پڑی ہے۔ اس کے والد ''معاشرہ صاحب'' کو سخت فکر لاحق ہے اور ماں ''انسانیت'' بھی سخت بے قرار ہے۔ وہ آخری بار اپنے جگر گوشے کو دیکھنا چاہتی ہے۔ جس کسی کو ملے براہِ مہربانی پاکستان واپس پہنچا دے۔ ''خلوص'' اگر خود پڑھے تو واپس آجائے۔ پاکستانی لوگوں کو تمہاری سخت ضرورت ہے۔

14 اگست اور جاوید چوہدری صاحب کا ادھورا سچ

اصغر علی بھٹی
مغربی افریقہ

لندن میں تین مصروف ترین ہفتے گزارنے کے بعد کاسابلانکا کے ٹرانزٹ ہال میں داخل ہوتے ہوئے کافی سستی سی چھا رہی تھی۔سوچا اچھا ہے نائیجر کے صحرا میں داخل ہونے سے پہلے کچھ مراکش کے نیم ٹھنڈے ماحول میں سُستا لیا جائے۔سوادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ پرسکون گوشہ تو نظر نہ آیا البتہ شیشے کی خوبصورت دیواروں پر چسپاں فری وائی فائی کا اشتہار نظر آ گیا۔وہ کیا کہتے ہیں اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔یعنی غنودگی کو بھول کر فوری فون آن کر لیا ۔سوچا پاکستان کے الیکشنز کا حال ہی جان لیا جائے ۔پھر کیا تھا یوٹیوب مجھے الیکشن،اسمبلیاں،متوقع وزارتیں،لیڈرران ،اپوزیشن لیڈر اناور گورنران سے گھماتی ہوئی جاوید چوہدری صاحب کی دانش اور تاریخ دانی کے ہاں لے وارد ہوئی۔آپ کا 14 مارچ 2018 کا پروگرام ''کل تک'' سنتے ہوئے مجھے کسی سیانے کی یہ بات رہ رہ کے یاد آنے لگی کہ وہ زہر اُس شہد سے ہزار درجہ بہتر ہوتا ہے جس میں زہر بھی ملا ہوا ہو ۔جاوید چوہدری صاحب اپنے پروگرام کے تمہیدی الفاظ میں قائداعظم کی ذات کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔اچھی بات ہے ہمارے محترم قائد کی ذات ہی ایسی ہے کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔اور یہ مدح خوانی صرف 14 اگست ہی کو کیوں ؟ سارا سال کرنی چاہئے اور نہ صرف مدح سرائی بلکہ ان کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں پر ہی وطن کی تعمیر و ترقی کی بنیادیں استوار کرنا چاہئیں۔مگر اپنے ممدوح لیڈر کی مدح کی خاطر افراط وتفریط کی اندھی گہری کھائی میں اتر جانا یا حالات و واقعات کے پیش منظر یا پس منظر میں ڈنڈی مارتے ہوئے کسی کی ٹوپی کسی دوسرے کے سر پر سجا دینے کو کسی بھی طرح سے اُس لیڈر کی خدمت کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا بلکہ صریحاً زیادتی ہی گنی جائے گی۔اور یقیناً 14 اگست کو جاوید چوہدری صاحب قائداعظم سے ایسی ہی زیادتی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ آپ فرما رہے تھے'' یہ ملک قائداعظم محمد علی جناح کی مہربانی ہے اور قائداعظم کی شخصیت کتنی بڑی ہے۔

آپ اس کا اندازہ تین مثالوں سے لگا لیجئے ۔آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن دوسری جنگ عظیم کے دوران اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر تھا۔جاپان نے 15 اگست 1939 کو اسی کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ انڈیا اور پاکستان دونوں اسی دن کو اپنی آزادی کا اعلان کریں۔جواہر لال نہرو مان گئے مگر قائداعظم نے انکار کر دیا۔ان کا کہنا تھا کہ ہم جاپان کی غلامی کے دن کو اپنی آزادی کا دن نہیں بنا سکتے۔چنانچہ پاکستان نے جاپان کے سرنڈر سے ایک دن پہلے اپنی آزادی کے دن کا اعلان کیا بلکہ اپنے حصے کے تاوان کو بھی معاف کر دیا۔جاپان آج تک قائداعظم کے ان دونوں اقدامات کی قدر کرتا ہے۔دوسری مثال قائداعظم صرف پاکستان کے بانی نہیں تھے بلکہ انہوں نے انڈونیشیا،ملایا،سوڈان لیبیا اور مراکش نائیجیریا،الجیریا اور تیونس کی آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔انہوں نے ایران کو سویت یونین سے اور عراق کو برطانیہ سے بچایا تھا۔چنانچہ یہ 10 ممالک قائداعظم کی وجہ سے آج بھی ہمارا احترام کرتے ہیں۔''

جاوید چوہدری صاحب آپ کی تاریخ دانی کو سلام۔یقیناً آپ ہمارے ملک کا ایک بڑا نام ہیں اور بڑے دانشور کے طور پر جانے جاتے ہیں لیکن افسوس یہاں آپ کچھ تو خلاف واقعہ بیان کر رہے ہیں اور کچھ اس کی ٹوپی اُس کے سر پر تھوپ رہے ہیں۔سادہ سی بات ہے کہ ٹیم میچ جیتتی ہے،کپتان ٹرافی اُٹھاتا ہے مگر گول اور وکٹیں انفرادی طور پر کھلاڑیوں کا طرہ امتیاز گنے جاتے ہیں۔1992 کے ورلڈ کپ کو ہی لیجئے میچ پاکستان جیتا۔کپ کپتان عمران خان صاحب نے اُٹھایا مگر ابتداء ہی میں آئن بوتھم کو آوٹ کر کے فتح کی بنیاد رکھنے والا اور پھر 141 کے سکور پر چوتھی وکٹ گرا کر کھیل کا پانسہ پلٹ دینے والا وسیم اکرم انفرادی طور پر اتنی ہی عزت سے جانا جاتا ہے۔وسیم اکرم کی تین وکٹیں اور مین آف دی میچ کا ایوارڈ کبھی بھی جناب عمران خان صاحب کو نہیں دیا جا سکتا۔لیکن آپ اپنے زور بیان سے ایسا کرنے پر ہی مصر ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ محمد علی جناح کی شخصیت ایک محترم ذات ہے۔ انتہائی نامساعد حالات میں آپ نے اپنی پسماندہ قوم کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا مگر یہ خراج تحسین کہ'' قائداعظم صرف پاکستان کے بانی نہیں تھے بلکہ انہوں نے انڈونیشیا،ملایا،سوڈان لیبیا اور مراکش نائیجیریا،الجیریا اور تیونس کی آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔انہوں نے ایران کو سویت یونین سے اور عراق کو برطانیہ سے بچایا تھا'' بالکل خلاف حقیقت ہے۔کیونکہ قائد محترم پاکستان بننے کے بعد مندرجہ بالا کسی ملک یا مطلوبہ خطے کے دورے پر نہیں گئے اور نہ ان ممالک کے وفود آپ سے ملنے کے لئے آئے۔نہ آپ نے کبھی ان ممالک کی عوام سے ڈائریکٹ رابطہ کر کے انہیں آزادی کے حوالے سے گائیڈ کیا۔نہ آپ نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا اور نہ کسی بین الاقوامی فورم پر ان ممالک کے لئے آزادی کی

لا بنگ کی۔ جب ان میں سے کوئی بھی صورت وقوع پذیر نہیں ہوئی تو پھر آپ نے فی نفسہ ان ممالک کی آزادی کے لئے کیا رول ادا کیا ؟ ہاں اگر آپ کا منشاء یہ ہے کہ آپ کے دور حکومت میں آپ کی ہدایات کی روشنی میں آپ کے وزیر خارجہ اور آپ کی حکومت نے ان ممالک کی آزادی کے لئے بھرپور کردار ادا کیا تو یہ بات کسی حد تک قابل قبول ہوسکتی ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ ان مندرجہ بالا ممالک میں سے اکثر ممالک قائداعظم کی وفات کے بعد یا بہت بعد میں آزاد ہوئے۔ جیسے لیبیا یکم جنوری 1950 میں اور باقی تمام اس سے بھی بعد کی پیداوار ہیں۔

اسی طرح سے یہ ریوارڈ کہ قائداعظم نے جاپان کو اپنے حصے کا تاوان بھی معاف کردیا پہلے سے بڑھ کر خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ قائداعظم کی وفات 11 ستمبر 1949 میں ہوئی اور جاپان پر جرمانہ عائد کرنے والے سان فرانسسکو کانفرنس 8 ستمبر 1951 میں ہوئی۔ جس میں جاپان کے علاوہ 48 ممالک شامل ہوئے۔ اس کانفرنس میں جاپان اور باقی ممالک کے مابین ایک معاہدہ عمل میں آیا جسے تاریخ میں Peace Treaty of San Francisco یا Peace Treaty with Japan کا نام دیا گیا۔ اس کانفرنس میں قائد ملت لیاقت علی خان صاحب کے حکم پر پاکستانی وزیر خارجہ جناب چوہدری سر ظفراللہ خان صاحب شامل ہوئے۔

ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملہ اور جنگ عظیم دوئم میں ہزیمت کے بعد جاپان شکست وریخت کا شکار تھا۔ اتحادی ممالک کی طرف سے نت نئے مطالبات اور پابندیوں کا سامنا تھا۔ اسی دوران یہ کانفرنس سان فرانسسکو میں بلائی گئی۔ جس میں وہ ممالک مدعو تھے جن کے خلاف جاپان کی طرف سے جنگی کاروائیاں اور جانی و مالی نقصان کیا گیا تھا۔ جنوبی اور مشرقی ایشیائی ممالک میں سے ہندوستان اور برما نے کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ چین کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ جنگ عظیم دوئم کے وقت ابھی پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا تاہم برطانوی حکومت کی وجہ سے پاکستان کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ خود جاپان اس کانفرنس میں ایک شکست خوردہ ملک کی حیثیت سے شریک تھا اور اس کی قسمت کا فیصلہ اتحادی ممالک کے ہاتھ میں تھا۔ اتحادیوں کی طرف سے جو معاہدہ تشکیل دیا گیا اس کے نتیجے میں ہر متاثرہ ملک کو کروڑوں ڈالرز ملنے تھے۔ نیز جاپان کے لئے بہت سی ایسی پابندیاں تجویز کی گئیں تھیں جو کسی آزاد اور خودمختار ملک کی عزت ووقار کا تحفظ نہ کرتی تھیں۔ اس موقعہ پر پاکستانی وزیر خاجہ جناب چوہدری سر ظفراللہ خان صاحب کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے جاپان میں پاکستان کے قائم مقام سفیر جناب ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی صاحب (1963-1964) اپنی کتاب میں ذکر فرماتے ہیں ''ظفراللہ خان نے جو پاکستان کی قیادت کر رہے تھے پر جوش الفاظ میں جاپان کے لئے تقریر کی۔ جس میں اُنہوں نے رسول پاک ﷺ کی صلح کی مثالیں دیتے ہوئے ایک فاتح کے مفتوح سے ہمدرانہ سلوک کی لاثانی مثال بتایا۔

فصاحت کے اس نمونہ سے چند الفاظ یہاں درج کئے جاتے ہیں چونکہ اب یہ تقریر تقریباً تقریباً نایاب ہوگئی ہے۔ ظفراللہ خان نے کہا ''سوائے اس ایک تابندہ اور شاندار مثال کے جس نے عرصہ دراز تک مسلمانوں میں روائیت قائم کر دی تھی تاریخ شائد ہی ایسی کوئی گواہی پیش کرتی ہے جس میں فاتح نے مفتوح سے بڑی فیاضی کے جذبے کے تحت ایسا شاندار سلوک کیا ہو جس کی نہائیت نمایاں مثال فتح مکہ تھی۔ جسے ہوئے اب تیرہ سو سال ہوگئے ہیں مگر اس کی چمک دمک آج تک ماند نہیں پڑی۔ صلح مکہ نے بیس سال کے خون کے پیاسے دشمنوں کو ایک دوسرے کا دوست اور برادری بنا دیا۔ اس کے برعکس میں جو صلح دی جاتی ہے اس سے خرابیوں اور تباہیوں کا ایک سلسلہ پیدا ہوتا ہے'' (سفیر اور سفارت کاری۔ ایک درد کی کہانی از ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی پیرا ماؤنٹ پبلشنگ کراچی) آگے چل کر لکھتے ہیں ''کسی اور ایشیائی ملک نے، ہندوستان نے بھی اپنے حصے کا تاوان جنگ معاف نہیں کیا تھا۔ یہ محض پاکستان تھا جس نے تاوان معاف کیا۔ مجھے اتفاقاً اس کا علم ایسے ہوا کہ ایک مرتبہ میں سفارت کے پرانے فائل دیکھ رہا تھا جس میں ایک فائل پر نظر پڑی Acts of friendship towards japan اس میں جاپانی وزارت خارجہ کا ایک مراسلہ دیکھا جس میں پاکستان کا اس پر شکریہ ادا کیا گیا

تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک جاپانی پریس ریلیز کی کاپی تھی جس میں جاپان نے پاکستان کے اس عمل کو سراہا تھا'' (سفیر اور سفارت کاری۔ ایک درد کی

کہانی از ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی پیرا ماؤنٹ پبلشنگ کراچی) جاپان میں پاکستانی سفارتخانے کے ریکارڈ کے مطابق اس کانفرنس کے

فوری بعد پاکستان ان چند ممالک میں سے تھا جنہوں نے اپنا کمرشل آفس جاپان میں کھول دیا اسی طرح سے 1952 میں جاپان نے بھی اپنا ٹریڈ آفس کراچی میں کھول دیا۔

جناب جاوید چوہدری صاحب آپ سے عرض صرف اتنی ہے کہ جناب چوہدری سر ظفراللہ خان صاحب وزیر خارجہ پاکستان کی کامیاب سفارتکاری کو جناب قائداعظم کی جھولی میں یعنی وسیم اکرم صاحب کی وکٹیں اور مین آف دی میچ کا ایوارڈ جناب عمران خان صاحب کے سر منڈھنے پر آپ بضد کیوں ہیں؟ کہیں آپ کا قلم بھی توعلمی کرپشن سے آلودہ نہیں ہوگیا یا پھر سرکاری راہداریوں کی خنکی کے ڈر سے آپ نے بھی بزدلی کی قبا زیب تن کر لی ہے جو ایک اقلیتی فرقے کے پاکستانی ہیرو کا نام زبان پہ لاتے ہوئے جھوٹ کی نجاست تک کے پاس دھونی رما کر بیٹھ گئے ہیں۔

***

SARMAD GLOBAL
CHARTERED ACCOUNTANTS

QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS
WITH BIG 4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

- ✓ Company incorporation / Registered Office Address
- ✓ Personal Income Tax Return investigations,
- ✓ Rental Income Tax Returns
- ✓ UK State Pension Entitlement Review
- ✓ Advice on filling Gaps in UK State Pension
- ✓ UK State Pension / (Contracted Out) Tracing
- ✓ Private UK Pension Tracing.
- ✓ Assets Review for Inheritance Tax
- ✓ Appealing-Past years HRMC Penalties
- ✓ Preparation / Filing of Prior year tax returns
- ✓ Duplicate-Payslips/P60s

ICAEW CHARTERED ACCOUNTANTS

SARMAD KHAN ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD MORDEN SURREY SM4 5HP UK
TEL +44(0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002
E-MAIL: INFO@SARMADGLOBAL.COM
WEB. WWW.SARMADGLOBAL.COM
CELL +44 (0) 7903 416966

SKY TRAVEL WORLD

Munir Ahmad
www.skytravelworld.co.uk
munir@skytravelworld.co.uk
specialists for worldwide Destinations
Tel: 0207 112 8090
Fax: 08458389985
33 London Rd Tooting SW17 9jr
skytravelworld@gmail.com
Special offers Available

property renting
made
EASY & SIMPLE

N2 LETTINGS ESTATE AGENTS
020 34170607 www.n2lettings.com

SHARIF JEWELLERS
SINCE 1952
Timeless Jewels, Priceless Memories

Diamond • Gold • Kundan • Bespoke • Bridal Jewellery
Jewellery Repairs • Bullion Dealer • Best Jewellery Appraisal
WEDDING | PARTY | EVERYDAY

/SharifJewellers

LONDON
28 London Road, Morden
United Kingdom, SM4 5BQ
☎ +44 (20) 3609 4712
+44 (0) 7405 929 636

RABWAH
Aqsa Road, Rabwah
Pakistan, 35460
☎ +92 (47) 6212515
+92 (0) 307 465 7777

RASHID & RASHID

Solicitors, Advocates
Immigration Specialists
Commissioners of Oaths

راشد احمد خان

وکیل (پرنسپل)

Benefit with very competitive rates, tailored advice & service to suit your specific needs, 24 hour response to all online enquiries and our many years of experience

www.rashidandrashid.co.uk

مناسب ریٹس میں آپ کی مخصوص ضروریات کے تحت موزوں مشورہ، 24 گھنٹے آن لائن سروس اور ہمارا سالوں کا تجربہ

- Asylum & Immigration
- New Point Based System
- Settlement Application (ILR)
- European Law
- Nationality & Travel Documents
- Human Rights Applications
- High / Court of Appeals
- Family Matters and Divorce
- Switching Visas
- Over Stayers
- Legacy Cases
- Work Permits
- Visa Extensions
- Judicial Reviews
- Tribunal Appeals
- Student appeals

- اسائلم/سیاسی پناہ اور امیگریشن
- نیا پوائنٹ بیسڈ امیگریشن سسٹم
- ویزا میں تبدیلی
- ویزا توسیع/ایکسٹینشن
- سیٹلمنٹ درخواست (ILR)
- یورپین قانون
- اوور سٹیئرز
- جوڈیشل ریویو
- نیشنیلٹی اور سفری دستاویزات
- درخواست برائے انسانی حقوق/ہیومن رائٹس
- وراثتی معاملات/لیگیسی کیس
- ٹرائبیونل اپیل
- ہائی/کورٹ آف اپیل
- طلاق و دیگر خاندانی معاملات
- ورک پرمٹ
- سٹوڈنٹس اپیل

FREE CONSULTATION & LEGAL ADVICE
24 Hours Emergency Numbers

مفت قانونی مشاورت
24 گھنٹے ایمرجنسی سروس

07878 33 5000 / 07774222062

RASHID & RASHID LAW FIRM
211, The Broadway, Southall, UB1 1NB.
Near McDonalds Southall.
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

190 Merton High Street, Wimbledon
London SW191AX
Tel: 02085 401 666, Fax 02085 430 534
Email: law786@live.com

راشد اینڈ راشد لاء فرم
211، دابراڈو، ساؤتھ ہال، UB1 1NB نزد میکڈونلڈز ساؤتھ ہال
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

190 میرٹن ہائی سٹریٹ، ویمبلڈن
لندن SW19, 1AX
فون: 02085 401 666، فیکس 02085 430 534
ای میل: law786@live.com

SOW THE SEEDS OF LOVE